ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے تخلیقی سفر کا ارتقاء

کائناتِ اقبال

فرمودات، واقعات اور مکتوبات کے آئینے میں



ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے تخلیقی سفر کا ارتقاء

کائناتِ اقبال

فرمودات، واقعات اور مکتوبات کے آئینے میں

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

بک کارنر
جہلم۔ پاکستان

Kaynat-e-Iqbal
By: Dr. Haroon Rasheed Tabassum
Jhelum: Book Corner. 2017
240p.
1. Iqbaliat - Biography
ISBN: 978-969-662-076-1

اشاعت: 23 مارچ 2017ء

کائناتِ اقبال

تالیف: ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم   حروف نگاری: ذوالفقار احسن، محمد طارق طیب

ناشر:
گگن شاہد، امر شاہد
بک کارنر
پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز، جہلم، پاکستان

Publisher:
Gagan Shahid & Amar Shahid
Book Corner
Printers, Publishers & Booksellers
Jhelum. Pakistan.

CALL NOW +92 (544) 614977, (544) 621953 info@bookcorner.com.pk

find us on facebook. book corner showroom 0321-5440882

WWW.BOOKCORNER.COM.PK

مطبع: زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

انتساب:

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی سحرخیزی کے نام
جس نے انھیں حیاتِ جاوید عطا کی۔

حضرت شیخ نور محمد کی بصیرت اور حافظہ امام بی بی
کے حسنِ پرورش کے نام
جنھوں نے اپنے فرزند کو
رزقِ حلال کی پاکیزگی عطا کی۔

شمس العلماء سید میر حسن کے نام
جنھوں نے بحیثیت استاد
اقبال کی علمی و عملی تربیت کی۔

○○○

حُسنِ کائنات

لفظوں کو حُسن ، سوچ کو رعنائی دے گیا
اقبالؔ میری قوم کو بینائی دے گیا
(ہارون الرشید تبسم)

اقبال کی کائنات...... ہر عہد کی عکاس

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

اللہ کریم، کائنات کا خالق و مالک ہے۔ وہ اپنی مخلوق کا نظام چلانے کے لیے اپنا ہی حُسن انتخاب رکھتا ہے۔ ربِ کائنات، رب اللعالمین، اپنے نظام کائنات کو شعور و آگہی کی دولت سے مالا مال رکھنے کے لیے اپنے بندوں کو بصیرت عطا کرتا ہے۔ یہی بصیرت کائنات کو منور کرتی ہے۔ خالق کائنات کے انصاف اور انتخاب کو کوئی بھی چیلنج نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کی خوش بختی ہے کہ رب کریم نے انھیں فکر و عمل کی دولت سے سرفراز فرمایا۔ اقبال کی نظم و نثر میں کائنات مقید ہے۔ انھوں نے نثر میں فکری جولانیوں سے نظام حیات چلانے کا چارٹر پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات و احساسات کی ایسی ترجمانی ہے جسے پڑھ کر انسان دولت انسانیت سمیٹتا ہے۔ اخلاقیات، سیاسیات، مدنیات، اسلامیات، لسانیات اور معاشیات ایسے پہلوؤں کو زیر بحث لاتے ہوئے اقبال نے عظمت انسانی کا درس دیا ہے۔ جب قاری عظمت انسانی کا ادراک حاصل کر لیتا ہے تو اسے خودی کی منازل طے کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اقبال کی یہی کائنات انسانی جذبوں کی عکاسی ہے۔ قرآن و سنت کے عمیق مطالعہ نے اقبال کو مسلمانوں کے دلوں میں سرایت کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ قرآن پاک کی آیات اور احادیث نبوی کے تذکرے نے اقبال کے شعروں کو شہپر جبریل عطا کر کے عرفان ذات کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ اسلامی فلسفہ حیات پر دنیا کے معروف مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ڈاکٹر علامہ اقبال نے فکر و آگہی کی جو کائنات لفظوں کے پیرہن میں پیش کی ہے وہ ایک آئینہ کی مانند ہے جس میں ماضی نظر آتا ہے، حال کا تقابل محسوس ہوتا ہے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے کے منفرد پہلو نظر آتے ہیں۔

کئی صدیاں پہلے مسلمان حکماء صوفیا شعراء اور مفکرین نے انسان کے ماضی کی تمام دولت علم و ہنر سمیٹ کر اس کو کیمیائے اسلام سے اکسیر حیات بنا دیا تھا۔ اسلام کے بعد کئی مذاہب اُبھرتے رہے اور اُبھرتے رہیں گے لیکن اسلام کے بعد کوئی دین اپنی وسعت زمانی و مکانی میں عالمگیر نہ ہو سکا اور نہ ہو گا تاریخ ادیان خود ختم نبوت ﷺ کی سب سے قوی شہادت ہے۔

اسلام کے علاوہ بہت سے احباب نے نسل انسانی کے ارتقاء اور اصلاح کے لیے اپنے فکری نظریات پیش کیے لیکن انسان جس در مقصود کے متلاشی ہیں وہ نہ "لینن" "کارل مارکس" کے سوشلزم میں موجود ہے نہ "گوئٹے" اور "ڈائنٹے" کے فلسفہ حیات میں ملتا ہے اور نہ کسی ڈارون کے نظریہ ارتقاء میں ہے نہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت میں اور نہ یہ دولت نایاب کی ٹرومین یا چرچل کی ڈائری میں مل سکتی ہے یہ لازوال دولت صرف محمد عربی ﷺ کے دامن حکمت میں ہی مل سکتی ہے۔ اقبال نے اس بارے میں کیا خوب کہا تھا۔

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہ فرمودہ است

لیکن انسانوں کو ہمیشہ خدا سے ہدایت یافتہ انسانوں کی ہدایت کی ضرورت رہی ہے۔ خصوصاً تاریخ کے اس دوراہے پر اس کی ضرورت اور بھی زیادہ تھی جب مسلمان حیرت کے دوراہے پر کھڑے تھے ایک طرف ان کا ماضی اور ان کا موروثی تمدن ان کا دامن تھامے ہوئے تھا اور دوسری طرف تہذیب جدید کی چکا چوند ان کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اس کے خیر و شر اور تعمیر و تخریب کے دونوں پہلو انہیں مبہوت کیے ہوئے تھے۔ جس سے ان کے عقائد متزلزل ہو رہے تھے۔ اس دور میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں بلکہ عامۃ الناس کو ایک بہت بڑی نعمت عطا کی اور ایک ایسا فلسفی عالم شاعر پیدا کیا جس نے نظری اور عملی فلسفوں کو یکجا کر دیا جو اسلامی عقائد و قوانین اور اس کی عظمتوں اور مقاصد سے بہرہ اندوز ہوا اور اس کے ساتھ ہی وہ مغرب کے فلسفے اور اس کے مذاہب سے بھی آشنائی رکھتا تھا۔ جس نے اس کے

خیالات وافکار میں وسعت پیدا کر دی چنانچہ اس نے اپنے فلسفہ کلام کو تابناک روشنی اور زبان کے چمکتے ہوئے شعلوں سے بھرپور کیا اور لوگوں کو دعوت حق دی اور عالم حاضر کو اس کے موجودہ رویے کے درد ناک نتائج سے ڈرایا اور اسلام کے حقائق کو اجاگر کیا۔ مقاصد اسلامی اور تاریخ اسلامی کو جلا بخشی قدرت نے اقبال کو نور بصیرت معرفت شاعرانہ فطرت اور درد دل عطا کرنے میں دل کھول کر فیاضی کی تھی جس کی مثال تاریخ عالم میں بہت کم نظر آتی ہے۔ ہر شاعر نے اپنے دور کی عکاسی کی ہے لیکن علامہ اقبال اپنے دور کے ساتھ ساتھ آنے والے دور کے بھی شاعر ہیں اس لیے انہیں مرد قلندر، مرد درویش اور نباض وقت کہا جاتا ہے۔

اقبال اسلامی فکر کے علمبردار تھے انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنی شاعری کی بنیاد اسلامی فکر و فلسفہ پر رکھی وہ سچے مسلمان تھے اور اس بات کے خواہاں تھے کہ مسلمان زندگی کے تمام رہنما اصول قرآن وسنت سے حاصل کریں۔

اسلام ایسے مذہب کا نام نہیں ہے جو صرف انسان کی نجی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کا داعی ہو اور جس کا کل سرمایہ حیات کچھ عبادات چند افکار اور مٹھی بھر رسوم پر مشتمل ہو۔ بل کہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول ﷺ کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر اور صورت گری کرتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو کو ہدایت الٰہی کے نور سے منور کرتا ہے۔ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی معاشرتی ہو یا تمدنی مادی ہو یا روحانی معاشی ہو یا سیاسی اور ملکی ہو یا بین الاقوامی اسلام کی اصل دعوت یہ ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری وساری ہو اور دل کی دنیا سے لے کر تہذیب وتمدن کے ہر گوشے تک خالق حقیقی کی مرضی ہو۔

علامہ اقبال اسلامی ثقافت کی روح پر گفتگو کرتے ہوئے "محدود مذہبی نقطۂ نظر اور اسلام کے انقلابی نقطۂ نظر" کا فرق بڑی خوبی سے واضح کرتے ہیں۔ ایک صوفی بزرگ واقعہ معراج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

محمد عربی ﷺ آخری آسمان پر گئے اور واپس آ گئے قسم خدا کی اگر میں اس معرفت و بلندی پر گیا ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا"

یہ ایک جملہ محدود مذہبی نقطہ نظر اور انبیاء کے انقلابی نقطہ نظر کے فرق کو واضح کر دیتا ہے۔ جس شخص کے پیش نظر صرف اپنی ذات کی اصلاح اور خود کو عرفانی رفعتوں اور بلندیوں سے آشنا کرنا ہو وہ حق باری تعالیٰ تک پہنچنے کو اپنا منتہی سمجھے گا اور اس اونچے مقام کو حاصل کرنے کے بعد دنیا کی طرف لوٹنا اور زمانے کے تلاطم میں داخل ہونا گوارا نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے برعکس نبی کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بلندی پر جانے کے بعد آب وگل کی دنیا کی طرف واپس آتا ہے اور جو معرفت اور روشنی اسے حاصل ہوتی ہے اس کی مدد سے ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ وہ تاریخ ساز قوتوں پر غلبہ حاصل کرتا ہے اور انسانی تہذیب وتمدن کی تشکیل جدید کا انقلابی انجام دیتا ہے۔ اسلام زندگی سے فرار کی نہیں زندگی کی تعمیر کی تعلیم دیتا ہے اور پوری زندگی کو سنوارنے کے لیے ہدایت کا ایک مکمل نظام بھی پیش کرتا ہے۔ ہدایت کے اسی نظام کا نام دین اور اسلامی نظریہ حیات ہے۔

اسلام کا نظام حیات انسانی معاشرے کی تمام ضرورتوں کو مدنظر رکھتا ہے اور صحت مند بنیادوں پر اس کے مستقبل کے ارتقاء کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ اسلام پوری قوت کے ساتھ روحانی حقیقت کا اظہار کرتا ہے اور مادی وسائل کو اخلاقی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے وہ انسان میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز تیرے لیے ہے لیکن تیرے مقاصد بہت بلند و بالا ہیں بقول اقبال:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

ڈاکٹر علامہ اقبال پکے مسلمان اور سچے عاشق رسول ﷺ تھے وہ توحید میں کسی قسم کا اشتراک گوارا نہیں کرتے مسلمانوں میں بعد میں جو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بحثیں چھڑ گئیں۔ اقبال کے نزدیک یہ بحثیں دینی نہیں بل کہ فلسفیانہ مسائل و مباحث ہیں۔ اسلام میں توحید کے مقابلے

میں فقط شرک ہے اسلام پیش کرنے والے نبی کی خودی تمام انبیاء اور انسانوں کے مقابلے میں زیادہ بیدار اور استوار تھی اس لیے ان کی زندگی اسوہ حسنہ بن گئی اسلام ایک خالص ترین پیغام حیات ہے نہ نبی کی ترقی کی کوئی انتہا ہے اور نہ عام انسانوں کی ترقی کی کوئی حد......... ارتقاء جاری ہے اور جاری رہے گا۔ اگر قرآن واضح طور پر محمد ﷺ کو خاتم النبیین نہ بھی کہتا تو بھی وضاحت مقصود دین کے بعد کسی اور نبی کا آنا تحصیل حاصل ہوتا۔

اقبال بڑی شدت سے ختم نبوت ﷺ کے قائل تھے۔ ایک مغربی مفکر نے اقبال کے عقائد پر یہ اعتراض کیا کہ ایک ایسا انسان جو ارتقائے لامتناہی کا قائل ہو ختم نبوت کا کس طرح قائل ہو سکتا ہے؟ جب زندگی ابدالا باد تک نئے اقدار حیات پیدا کر سکتی ہے تو کسی کی ایک شخص کی تعلیم یا زندگی خاتم کیسے ہو سکتی ہے؟..................

اقبال کے ہاں اس کا جواب یہ ہے کہ زندگی کے لامتناہی ارتقاء اور اس کے محدود ممکنات کو واضح کر دینا ہی نبوت کا منتہی ہے یہ کام ختم ہو گیا تو نبوت بھی ختم ہو گئی۔ خود نبی کے انسان کامل ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی اپنی ذات کے لیے کوئی بلند تر درجہ ارتقاء باقی رہا............ ارتقاء کی آخری منزل تو خدا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی فرد لامتناہی ارتقاء سے بھی خدا تو نہیں بن سکتا نہ عمل کی کوئی انتہا ہے اور نہ علم کی.............. اسی لیے تو نبی مسلسل استغفار بھی کرتا ہے اور ''رب زدنی علما'' کی دعا بھی مانگتا ہے۔ اسلام کا مقصد زندگی کو کسی ایک صورت میں جامد کرنا نہیں بل کہ ایک انقلاب و ارتقاء کا راستہ بتاتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

ہر لحظہ نیا طور نیا برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

اقبال ایک آفاقی شاعر ہیں کیونکہ اس کی شاعری کی بنیاد ایک ایسے فلسفہ حیات پر ہے جو عالمگیر ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اور جو نہ صرف مسلمانوں بل کہ عالم انسانی کے لیے رحمت ہے فلاح کا راستہ ہے۔ اقبال کی شاعری بھی محض مسلمانوں کے لیے نہیں جن لوگوں نے اقبال کو محض ایک قوم یا طبقے کا شاعر سمجھ لیا ہے وہ ان کے کلام کی آفاقیت کو سمجھے ہی نہیں انہوں نے یہ رائے کم نظری کی بنیاد پر قائم کر لی ہے اور اس طرح وہ اقبال کے فکر وفن کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ جب بھی اسلام ایک قوت کی حیثیت سے ابھرے گا دنیا اقبال کو ایک آفاقی شاعر تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی۔

اقبال نے سب سے زیادہ زور اپنی شاعری میں احترام آدمیت پر دیا ہے اور دنیا کو اس کے احترام سے خبردار کیا ہے۔

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نظر میں ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

دور جدید میں "احترام آدمیت" پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان جس کے لیے کائنات تخلیق کی گئی جسے اشرف المخلوقات کہا گیا اس کے علاوہ دنیا کی ہر چیز کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ احترام آدمیت کے ناطے اقبال کا مرد مومن صرف مسلمانوں کا غمخوار نہیں بل کہ اس کی ہمدردی کا فیضان کا فرد مومن سب کے لیے یکساں ہے۔

اقبال انسانی ارتقاء کے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ انسان کے ذہن سے خوف موت اور ہلاکت کا خوف ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک اصل چیز زندگی کے

مقاصد ہیں اور مقصد کے سفر میں وہ موت وحیات دونوں سے بے نیازی کا احساس انسان کے اندر پیدا کر دینا چاہتے ہیں۔

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

پچھلی ربع صدی میں کلام اقبال کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہے وہ ہماری شعری تاریخ کا ایک یادگار موڑ ہے۔ اس سے قبل شعراء کی اپنی ایک سکہ بند روایت تھی جو بڑی حد تک غزل قصیدہ اور دوسری ایسی اصناف سے متعلق تھی۔ یہ روایت ہم عصرانہ فکری تحریکوں اور قومی تقاضوں سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارا شاعر درخت کی کسی اونچی شاخ پر بیٹھا زندگی سے قطعاً بے نیاز ہو کر گیت گا رہا ہے وہ کسی سرحد پر زندگی کے قریب نہیں آتا تھا۔ اقبال نے شعراء اور عمل زندگی میں ایک ربط باہم پیدا کیا اس لیے اقبال کی شاعری ایک عالم ملی دستاویز کی حیثیت حاصل کر گئی۔ قیام پاکستان کے بعد کلام اقبال کی افادیت اور بھی مسلم ہو گئی ہے کیونکہ اس میں ہمارے خوابوں کی تعبیر متحیر نظر آتی ہے۔ اقبال کا کلام صرف ایک شاعر کا کلام نہیں بل کہ حکیم الامت کا فرمان ہے۔ وہ بیک وقت مفکر بھی ہیں اور شاعر بھی وہ ایک مفکر کی طرح سوچتے ہیں اور مجاہد کی طرح میدان عمل میں کود پڑتے ہیں۔

اقبال بجا طور پر شاعر مشرق نقاش فطرت مفکر پاکستان اور حکیم الامت ہیں ان کی آواز واقعی بانگ درا ہے جو نہ صرف اس دور میں بل کہ آج کے دور میں بھی قافلے اور قافلے والوں کو صحیح سمت رواں رکھتی ہے۔ ان کے اشعار پر غور وفکر کرنے سے انسان کے سامنے ایک نیا جہان کھل جاتا ہے۔ ان کے فلسفے کی روشنی میں ان کے مقصد حیات سے آگہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ موجودہ دور میں اقبال کی ضرورت کل سے زیادہ ہے۔ ان کے افکار کل کی طرح آج بھی ہماری زندگی کے تمام مسائل پر محیط ہیں۔ ہم بجا طور پر ان کو آنے والے کل کا شاعر کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان کی دور رس نگاہوں' نور معرفت' بصیرت نے اسلام اور قرآن کے عمیق مطالعے سے انہوں نے ایک ایسا مقام پا لیا تھا۔ جہاں پر کھڑے ہو کر وہ

تمام عالم اسلام پر نظر ڈال سکتے تھے۔ ہر مسئلے کو نئے رنگ نئی روشنی میں دیکھ سکتے تھے۔ اقبال کا شعور ان بہت سے لوگوں سے زیادہ بیدار تھا جو اس سے پہلے ہو گزرے تھے۔ اقبال نے بڑی گہرائی تک پہنچ کر قرآن حکیم میں غوطہ زنی کی ہے۔

عالم اسلام کا مردِ خود آگاہ اور دنیائے علم و ادب کا یہ آفتاب جہاں تاب ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا لیکن اس درخشاں آفتاب کی کرنیں دائمی زندگی اختیار کر گئیں۔ ہم اپنی عملی زندگی میں اس کے پیش کردہ اصولوں سے راہنمائی بصیرت اور فیضان حاصل کرتے رہیں گے۔

انسانی تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ مذہب کو ترک کر کے انسان نہ صرف یہ کہ اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو جاتا ہے بلکہ خود مادی وسائل کے استعمال میں بھی وہ توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوت و اقتدار میں اضافہ خیر و صلاح اور نیکی و فلاح میں اضافے کا باعث نہیں بنتا۔ علامہ اقبال یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے مسلمانوں کو قرآن و سنت سے رہنمائی حاصل کرنے پر زور دیتے تھے۔ مذہب سے دوری کے نتائج سے وہ واقف تھے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

زندگی کی شب تاریک صرف مذہب کی روشنی سے منور ہو سکتی ہے ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا'' اقبال کی حکیمانہ نظر نے اس وقت محسوس کر لیا تھا کہ حضرت انسان چاند پر جا کر کائنات کو تسخیر کرے گا لیکن انسانی رویوں سے غافل رہے گا۔ انھوں نے سائنس کی ترقی میں پیش آنے والے

واقعات و حادثات کا ذکر فرمایا۔ ان ارشادات کی صداقت کے حق میں ہر آنے والا دن جواز پیش کر رہا ہے۔ ابھی تک سائنسدان سوچ بھی نہ سکتے ہوں گے۔ جب علامہ اقبال ؒ نے فرما دیا۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

یہ ایک پیش گوئی ایٹم یعنی ذرہ کی حقیقی طاقت کے انکشاف کے بارے میں ہے۔ اس وقت اس کو زیادہ سے زیادہ ایک فلاسفر کی خیال آرائی قرار دیا گیا۔ لیکن یہ ایک پیش آنے والی حقیقی اطلاع تھی۔ علامہ اقبال تو ۱۹۳۸ء میں ہمیں غم جدائی دے گئے اور یہی ایٹم بم ۶ اور ۹ راگست ۱۹۴۵ء میں جاپان کے خوبصورت شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کو تباہ کر گیا۔ ۱۹۶۷ء میں انسان نے چاند پر قدم رکھ لیا اقبال کی یہ پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی کہ سورج شعاعوں اور تسخیر کائنات کرنے والا انسان اپنی زندگی کو تاریک کر گیا۔

یہ بھی حقیقت ہے سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان مادہ پرست ہوتا جا رہا ہے اور روحانیت کا نام و نشان مٹتا جا رہا ہے اس ترقی نے زمان و مکان کے نظریے بدل دیے راکٹوں اور میزائلوں کے ذریعے انسان ستاروں پر کمندیں ڈال چکا۔ مشینوں کی ایجاد نے انسان کو مادی سہولتیں جسمانی آرام تو بہت پہنچایا لیکن اس کے باوجود ذہنی سکون اور اطمینان قلب میسر نہ آسکا اور علامہ اقبال کی یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ ستاروں کی گزرگاہوں کو ڈھونڈنے والا اپنے افکار کی دنیا میں ناکام رہا کیونکہ سائنس نے انسان کو ہوا میں اڑنا پانی میں تیرنا تو سکھا دیا لیکن زمین پر رہنا نہیں سکھایا۔ ہر چند کے وہ جوانوں کو نئے حوصلے اور ولولے دیتے ہیں۔

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اور "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن اس کے پس منظر میں

وہ حقیقتاً نوجوانوں کو محنت کی طرف راغب کرتے ہیں۔ خودنگری خودشناسی اور خودآگہی کے آداب سمجھا سکھا کر آزاد، پروقار اور باعزت زندگی کی راہ دکھلاتے ہیں۔ وگرنہ انہیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اس پرواز سے کیا فائدہ جو انسانیت کو حیوانیت کے مقام پر کھڑا کردے اور اس پرواز کی علت کیا جو مریخ پر پہنچنے کے بعد بھی انسانی زندگی کی شب تار کو سحر نہ کرسکے۔ اور زندگی کو مزید مسائل کی دلدل میں دھکیل دے امریکی ماہرین اقتصادیات کی رپورٹ کے مطابق ایک خلائی جہاز کی تیاری میں اتنا خرچ آتا ہے کہ جس سے زمین کی پوری آبادی کئی برس تک فکر معاش سے آزاد ہوسکتی ہے۔ انسانی معیشت پر یہ اتنا بڑا بوجھ ہے کہ جس سے امریکی ماہرین بھی کانپ رہے ہیں۔

اقبال سمجھتے ہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی میں جو تبدیلیاں آرہی ہیں وہ ذرائع و وسائل کی دنیا میں ہیں۔ مقاصد اور اصول و اخلاق کی دنیا میں نہیں۔ زمان و مکان کی رکاوٹیں دور ہو رہی ہیں اور انسان کا اقتدار بڑھ رہا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کا یہ تقاضا تو ہرگز نہیں کہ مقاصد زندگی اصول اخلاق اور اقدار حیات کو بھی تبدیل کردیا جائے اگر ہوائی جہاز جیٹ اور راکٹ کے استعمال سے زمین کی طنابیں کھچ گئی ہیں تو اس کے لیے یہ معنی کب ہیں کہ زنا جو کل تک حرام تھی آج حلال ہو جائے اگر برقی قوت کے ذریعے انسان کے پاس وہ طاقتیں آگئی ہیں جو پہلے صرف جنوں اور فرشتوں کو حاصل تھیں جو خیر و شر کے اصولوں کی صداقت پر اس کا آخر کیا اثر پڑتا ہے۔ دراصل یہ تمام مادی ترقیات صرف اسی وقت مفید ثابت ہوسکتی ہیں جب یہ انسان کی بھلائی کے لیے استعمال ہوں۔ یہ قوتیں جو انسان کو حاصل ہوئی ہیں اس وقت نافع ہیں جب اعلیٰ مقصد حیات کا تابع ہیں۔

اقبال کے تعلیمی نظریات کی طرف نظر ڈالیں تو وہاں بھی اقبال تعلیم کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ اسے چراغ راہ سمجھتے ہیں منزل نہیں حقیقی منزل ان لوگوں کا نظریہ حیات اور تمدن و ثقافت ہے جن کی خدمت اسے کرنی ہے اے این وائٹ ہیڈ نے یہ کہہ کر اس نکتے پر بہت زور دیا تھا کہ "تعلیم کی روح یہ ہے کہ وہ مذہبی ہو" اقبال بھی یہی کہتے ہیں کہ اسلام ہماری زندگی اور تعلیم کا مقصد ہو

چاہیے اپنے ایک خط میں (جو انہوں نے غلام السیدین کو لکھا تھا) لکھتے ہیں:

''علم سے میری مراد وہ نہیں کا علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہو۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آجاتی ہے۔ جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ علم کو مسلمان کرے''

آگے لکھتے ہی۔

''بولہب حیدر کرار کن''

اگر بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسانی کے لیے سراپا رحمت بن جائے''

اسلام میں تعلیم کی اہمیت مسلم ہے۔ تاریخ انسانیت میں یہ منفرد مقام اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ سراپا علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیامبر ثابت ہوا۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی و جہالت سے نہیں بل کہ علم اور روشنی سے کیا ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن ایسا نہیں جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا۔ یونان اور چین نے غیر معمولی علمی اور تمدنی ترقی کی لیکن وہ بھی تمام انسانوں کی تعلیم کے قائل نہ تھے بل کہ اہل علم کے ایک ہی طبقے پر قانع ہو گئے۔ افلاطون اپنی جمہوریہ (Republic) میں جو اونچے سے اونچا خواب دیکھ سکا اس میں بھی فلاسفہ اور اہل نظر کے ایک مخصوص طبقے کو ہی اس امتیاز سے نوازا گیا۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے تمام انسانوں پر تعلیم کو فرض قرار دیا اور اس فرض کی انجام دہی کو معاشرے کی ایک ذمہ داری بنایا۔

تعلیم کسی قوم کے سماجی نظریات اور ثقافت سے گہرے طور پر مربوط ہوتی ہے۔ بنا بریں کسی قوم کا نظام تعلیم اپنے مزاج مواد اور موضوعات کے اعتبار سے نہ تو نظریاتی رنگ سے خالی ہو سکتا ہے اور نہ اس میں اتنی معروضیت Objectivitve ممکن ہے کہ اسے اقدار کی گرفت سے آزاد قرار دیا جا سکے

۔گویا تعلیم مذہب اور عقیدہ سے الگ نہیں ہو سکتی بے عقیدہ تعلیم لامرکزیت اور جزو پرستی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ طلباء میں اجتماعی تصورات پیدا نہیں کر سکتی اور نہ ہی اخلاقی اقدار اجاگر کر سکتی ہے۔ بے عقیدہ تعلیم زندگی کے بنیادی اور زندہ مسائل پر عبور نہیں رکھتی۔ اقبال ان تمام نتائج پر گہری نظر رکھتے تھے اسی لیے وہ تعلیم نے جو مسائل پیدا کیے ہیں اقبال نے بہت پہلے ان مسائل کو ابھرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

مشہور اہل قلم والٹر لپ مین walterlipman نے ''اس مضطرب دنیا میں تعلیم کی کیفیت کے موضوع پر ایک تقریر میں کہا تھا۔

''اسکول اور کالج دنیا میں ایسے افراد بھیجتے ہیں جو اس معاشرے کے تخلیقی اصولوں کو نہیں سمجھ پاتے جس میں انہیں رہنا ہے۔ اپنی ثقافتی روایت سے محروم نئے تعلیم یافتہ مغربی افراد اپنے ذہن و جذبات میں مغربی تہذیب کے تصورات اصول اور بنیادوں کا اور اس کی منطق و استدلال کا کوئی احساس و شعور نہیں رکھتے۔ اگر یہی نہج رہی تو موجودہ تعلیم آخر کار مغربی تہذیب کو تباہ کر دے گی اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تباہ ہو رہی ہے۔''

ڈاکٹر فرینک ایڈیلوٹ Adylotefrank نے امریکی تعلیم کے بارے میں لکھا ہے۔

''مقاصد کے بجائے تکنیک اور ذرائع سے وابستگی ادب فلسفہ تاریخ اور مذہب کے مطالعہ کو حقیقی آزادی سے محروم کر رہی ہے''

علامہ اقبال ایسی تعلیم کو بے فائدہ سمجھتے ہیں جو انسان کی ذہنی جسمانی اور اخلاقی تربیت نہ کر سکے بقول اقبال۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ
گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

اقبال بچوں کو شاہین صفت بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے انہیں ان خداوندان مکتب سے شکایت تھی جو شاہین بچوں کو خاکبازی کا سبق دے رہے تھے۔ وہ بچوں میں وہ تمام صفات دیکھنا چاہتے تھے جو نہ صرف انہیں مسلم معاشرے کے لیے بلکہ تمام دنیا کے لیے بہترین انسان بنا دیں۔

علامہ اقبال ابن خلدون کی طرح صرف کتابوں کے علم ہی کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ بزرگوں کی صحبت اور ان کے فیضان نظر کی تاثیر وہ چیز ہے جو انسان کے قلب ونظر کی پرورش کے لیے ضروری ہے۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل علیہ السلام کو آداب فرزندی

اقبال نے اس دور میں جو تعلیمی نظریات پیش کئے وہ آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ کیونکہ اقبال نے اسلامی فلسفہ وفکر پر اپنے افکار کی بنیاد رکھی اور اسلام ہمہ گیر مذہب ہے جو ہر دور کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ جو گزرا ہے جو گزرنے والا ہے اقبال کی نظر ہر دور پر ہے ان کی نظر سے کچھ پوشیدہ نہیں۔

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں ہے مرد قلندر کی نظر سے
معلوم نہیں مجھ کو تیرے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے

اقبال کے ان تعلیمی نظریات کا سنجیدہ مطالعہ انسان کے فکر ونظر میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے افسوس یہ ہے کہ اقبال کو سمجھنے کے لیے تعلیم وتدریس کے نظام میں جو تبدیلیاں کرنی چاہیں تھیں اقبال کی نظریاتی مملکت بھی ان سے اب تک محروم ہے۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر تشنگی سے مرنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔

بعض تجدد پسند حلقوں کی طرف سے اقبال پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اقبال عورتوں کی تعلیم

کے خلاف تھے اور وہ عورت کو جدید معاشرے میں اس کا صحیح مقام دینے کے حق میں بھی نہیں ہیں اور انہوں نے اس باب میں تنگ نظری سے کام لیا ہے۔

عورت کے بارے میں اقبال کا نظریہ بالکل اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے وہ عورت کے لیے وہی طرز زندگی پسند کرتے ہیں جس کی اجازت اسلام نے دی ہے۔ ان کے خیال میں عورت کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو مردوں کو ہیں لیکن دونوں کا دائرہ کار جدا جدا ہے۔ دونوں اپنی اپنی استعدادوں کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے تمدن کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ غیر مسلم اور متعصب مخالفین اسلام یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں عورت کو بہت ادنیٰ درجہ دیا گیا ہے۔ جبکہ قرآن مجید نے یہ کہہ کر کہ "وہ عورتیں" "تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو" عورت اور مرد کی رفاقت کو تمدنی ضرورت کے لیے لازمی ٹھہرایا ہے۔ عورت کی عظمت کی اس سے بڑی کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ اسلام میں عورت اور ماں کا رتبہ کیا ہے اس پر اقبال نے "رموز بے خودی میں ایک بلیغ نظم لکھی ہے۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔

"خدا نے مرد و زن کو ایک دوسرے کا لباس بنایا ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بغیر اقدار حیات کے لباس سے عریاں ہو جاتا ہے۔ عشق حق کا آغاز ماں کی محبت سے ہوتا ہے۔"

جس قوم میں عورتوں کی زندگی احترام سے محروم ہے وہاں مردوں کو بھی حیات صالح نصب نہیں ہو سکتی ایک حکیم کا قول ہے کہ "کسی کی تہذیب کو جانچنے کا درست معیار یہ ہے کہ دیکھا جائے اس میں عورت کا کیا مقام ہے۔ اگر عورت ذلیل ہے تو قوم بھی ذلیل ہے اور تہذیب سے عاری ہے"

تہذیب مغرب میں عورت کی آزادی کا جو تصور ابھرا ہے۔ وہ افراط و تفریط کا شکار ہونے کے باعث غیر متوازن ہے۔ دیگر معاشروں کی طرح مغرب میں بھی عورت کو مرد کے غلام کی حیثیت دی جاتی رہی اور اب آزادی نسواں کی تحریک کا مطمع نظر یہ تھا کہ عورت کو زندگی کے ہر معاملے میں مرد کے دوش بدوش کر دیا جائے۔ اقبال کو اس نظریے سے شدید اختلاف ہے شاید ان کی دور رس نگاہیں اس تباہی و

بربادی کو بہت پہلے ہی دیکھ رہی تھیں جو عورت کی بے جا آزادی کے سبب ہونے والی تھی۔ اپنے ایک لیکچر "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

"میں مرد اور عورت کی مساوات مطلق کا حامی نہیں ہوں قدرت نے ان دونوں کو تفویض جدا جدا خدمتیں کی ہیں۔ مغربی دنیا میں جہاں نفسانفی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے۔ عورتوں کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ہوگا اور نظام معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی"

دور جدید کا ایک مفکر "ایلکس کیریل" مغربی تہذیب میں عورت کے کردار کے بارے میں لکھتا ہے۔

"موجودہ سماج کی سب سے فاش غلطی یہ ہے کہ اس نے تربیت کے لیے خاندان کے مقابلے مدرسوں پر اعتماد کیا ہے۔ آج کی ماں اپنے بچے کو نرسری سکول میں صرف اس غرض سے چھوڑ آتی ہے کہ وہ اپنی معاش کے لیے آزاد ہو، اپنی ہوس پوری کر سکے، فضول قسم کے آرٹ پرستی کے لیے اور برج کھیلنے یا سینما دیکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت بچا سکے۔ اس طرز زندگی سے خاندان کے نظام کو جس کے زیر اثر بچہ بہت کچھ سیکھتا تھا بالکل درہم برہم کر دیا ہے۔"

اقبال بھی مغربی تہذیب میں آزادی نسواں کی اس تحریک کے اسی لیے مخالف نظر آتے ہیں کہ وہ عورت کو امومت کے فرض سے آزاد کر دیتی ہے۔

کوئی پوچھے حکیم و یورپ سے
ہندو یونان ہیں جس کے حلقہ بدوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بیکار زن تہی آغوش

اقبال عورت کے لیے اس تعلیم کے سخت خلاف تھے جو اسے اس کے فرائض اور صلاحیتوں سے آگاہ کرے جس سے وہ نام نہاد آزادی کی طرف راغب ہو۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نا زن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان عورتوں کے لیے اسوہ کاملہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا ؓ ہیں۔ عیسوی دُنیا مریم طاہرہ صدیقہ کی پرستش کرتی ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں بھی حضرت مریم ؑ کا بڑا احترام ہے اور یہ فقط اس نسبت سے کہ وہ حضرت عیسیٰ ؑ کی ماں ہیں اور ان کی عفت کا خدا شاہد ہے۔ لیکن فاطمۃ الزہرہ ؓ تین بلند ہستیوں کا مرکز ہیں۔ محمد ﷺ کی بیٹی علی جیسے جلیل القدر انسان کی بیوی اور امام الشہداء حضرت امام حسین کی ماں ہیں۔

اس کے بعد اقبال مسلمان عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے دورِ حاضر کے فتنوں سے آگاہ کرتے ہیں جو عورت کی پاکیزگی کے لیے تخریبی حملوں سے کم نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تقلید فرنگ پر مسلمان عورت دین و اخلاق سے کنارہ کش ہو کر جھوٹی آزادی کے چسکے میں اپنی پاکیزہ فطرت کو خیر باد کہہ دے۔

علامہ اقبال کے تبلیغی کلام میں دو چیزیں پہلو بہ پہلو ملتی ہیں ایک تہذیب جدید پر مخالفانہ تنقید اور اس کے مقابلے میں اسلامی نظریہ حیات کی تعلیم کم و بیش تین سو سال سے ایشیا مسلسل زوال پذیر رہا۔ سیاسی غلام کا اثر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر پڑتا ہے۔ قوم کو ابھارنے کے لیے مختلف علاج تجویز ہونے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ مغربی تعلیم حاصل کرو تو دین کے ساتھ ساتھ دنیا بھی سنور جائے گی کوئی روایتی دینی تعلیم کو جدید علم و فنون پر فوقیت دیتا تھا اور اس کے نزدیک یہی راہ نجات تھی۔ علام اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ علاج غلط ہیں ملت کا اصل مرض نفسی مرض ہے وہ فقط قرآن کی بتائی ہوئی اس حکمت بالغہ کا قائل تھے کہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی نفسی حالت میں انقلاب پیدا نہ کرے۔

مغرب کے جید عالم "ولیم جیمز" نے لکھا ہے :

"جدید نفسیات کا سب سے بڑا انکشاف یہ ہے کہ زندگی کے متعلق زاویہ نگاہ بدلنے سے تمام زندگی بدل جاتی ہے۔"

دیکھیے : علم نفسیات کی ترقی نے انسان کو وہی راز بتایا جو از روئے وحی مسلمانوں اور تمام انسانوں پر چودہ سو سال پیشتر منکشف کیا گیا تھا۔ اقبال نے جب یہ تہیہ کر لیا کہ اس قوم میں انقلاب پیدا کیا جائے تو نہ وہ سیاست کی طرف مائل ہوئے نہ مسلمانوں کو نیا علم معیشت سکھانے کا ارادہ کیا کہ اقتصادی حالت درست ہو اور اس کے لیے ہر طرح سے دولت کماؤ اور بچاؤ اور نہ انہوں نے سائنس اور فلسفے یا جدید علم و فنون کو اس مرض کے لیے اکسیر سمجھا انہوں نے دیکھا کہ قوم کی نفسیات میں شدید خرابی ہے اسلامی زندگی کا تصور اس قوم کے ذہن سے نکل چکا ہے اور اسی اسلامی تصور کو پھر سے جگانے کی ضرورت ہے۔

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

قرآن حکیم تاریخ سے عبرت اور نصیحت حاصل کرنے پر زور دیتا ہے۔ اقبال جیسے جدت پسند اور انقلابی آفریں انسان کے ہاں حفظ روایات کا کوئی جامد مفہوم نہیں زندگی کسی انداز کو جوں کا توں نہیں دہراتی۔ ماضی سے صحت مندانہ ربط حیات آفریں ہوتا ہے۔ لیکن ماضی کی مقلدانہ پرستش حیات ملی کو جامد کر دیتی ہے۔ قومی روایات کی حفاظت ضرور کی جائے لیکن یہ نہ ہو کہ ملت ماضی پرست ہو جائے اقبال کا خیال ہے کہ ماضی پر تنقید کی جائے اور جو معاشرہ کی ضروریات پر پورا نہ اترے اسے رد کیا جائے ارتقا کا قانون ماضی کی طرف بازگشت نہیں بل کہ مسلسل انقلاب ہے یہ اصول قوموں کی زندگی میں اور بھی پورا اترتا ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

لیکن یہاں بھی وہ اس قوت کو جو شر انگیز ہو پسند نہیں کرتے اور اس کی مذمت کرتے ہیں وہ تمام بڑے بڑے فاتح خواہ وہ تیمور ہوں یا چنگیز، سکندر ہوں یا نپولین انسانیت کے دشمن ہیں۔ اقبال کا خیال ہے۔

دوزخ کے کسی طاق میں افسردہ پڑی ہے
خاکستر اسکندر و چنگیز و ہلاکو

عہد جدید کے دوسرے مسلم مفکرین پر اقبال کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ بیک وقت مشرقی و مغربی فلسفہ و ادب کے جید عالم تھے وہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھے۔ انہوں نے دونوں کو پڑھا اور دونوں سے متاثر ہوئے لیکن اس قدر مرعوب و مغلوب نہیں ہوئے کہ تقلید کی راہ اختیار کر لیتے فکر و فلسفہ میں اقبال کی حیثیت غیر مقلد کی ہے۔ وہ ایک طرف مغرب سے ناراض ہیں تو دوسری طرف مشرق سے بھی خوش نہیں۔ فلسفہ سیاسیات میں بھی اقبال کا یہی مسلک تھا کہ دنیا میں مروج سیاسی نظریات اور نظام ناقص ہیں اور بنی نوع انسان کے دکھوں کا مداوا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ انہوں نے عصر حاضر کے تمام سیاسی نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا سامراجی نظام کی ہوس کاریوں اور ناانصافیوں کی نشاندہی کی۔ وطنی قومیت کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا اور اس پر کڑی نکتہ چینی کی:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
ہم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

NATIONALISM کے تحت نسل انسانی قومی ریاستوں میں بٹ گئی اور اقوام کی باہمی رقابتوں کا وہ بھیانک سلسلہ جاری ہوا۔ جس کے نتیجے میں انسانیت دو تباہ کن جنگوں سے دوچار ہوئی اور انہی نظریات کے تحت آج بھی اسلحہ کی دوڑ جاری ہے۔

علامہ اقبال ایک طرف ایسے ریاستی نظام کے حق میں بھی نہیں جس کی بنا سرمایہ دار ہو اور دوسری طرف وہ "کارل مارکس" کے نظریہ اشتراکیت کو بھی رد کرتے ہیں۔ اور دونوں کو حق ناشناس اور آدم فریب سمجھتے ہیں انہیں ملوکیت میں انسان کی تذلیل نظر آتی ہے اور مغربی جمہوریت میں چنگیزی نظر آتی ہے۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اب اگر اقبال کے نزدیک سارے مروج نظام غلط ہیں تو آخر وہ کیا چاہتے ہیں؟ اقبال نے کوئی بندھا ٹکا نظام تو پیش نہیں کیا مگر ان کے فکر کے مطالعے سے کچھ اساسی اصول ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جن پر اقبال مثالی ریاست کی بنیادوں کو استوار کرنا چاہتے ہیں وہ ایک ایسی مثالی ریاست کے قیام کے خواہاں ہیں جو اسلام کے اصولوں پر وجود میں آئے گی۔ اس مثالی ریاست کا پہلا اصول حاکمیت الٰہی ہے دوسرے خدا کے قانون کی بالادستی' تیسرے اسلامی ریاست اسلامی معاشرت کے اصولوں پر بنے گی غیر اسلامی ریاستی نظام میں امور سلطنت و ریاست عام اخلاقی قیود سے آزاد ہیں۔ جس کی وجہ سے کرہ ارض پر فساد برپا ہے۔ فرد تو اخلاقی اقدار و قیود کا پابند ہے مگر جماعت قوم یا ریاست کے لیے اخلاق کی کوئی پابندی لازم نہیں۔ علامہ اقبال اسے شیطانی ریاست کہتے ہیں:

ہوئی دین و دنیا سے جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

فرد اور ریاست کی کشمکش کا مسئلہ ایسا ہے۔ جسے افلاطون سے لے کر رسل تک کوئی فلسفی حل

نہیں کر سکا۔ اقبال کی مثالی ریاست میں یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوگا۔ شہری اور ریاست دونوں ایک ہی ضابطہ اخلاق کے پابند ہوں گے۔ دونوں کے مقاصد ایک ہی ہوں گے دونوں کا مقصد اور نصب العین حاکمیت الٰہیہ کا قیام ہوگا تو پھر کشمکش کیسی..................عدم استحصال کی بنیادی وجہ تو یہی ہوگی کہ ریاست اور فرد دونوں ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے کام کریں گے معیشت نہ سرمایہ دارانہ ہوگی اور نہ اشتراکیبل کہ اسلامی ہوگی۔

اقبال کے نزدیک اسلام میں ذاتی ملکیت کی حیثیت امانت کی ہے ذرائع آمدنی اور مدات خرچ دونوں کے معاملے میں نہ فرد آزاد ہے اور نہ ہی ریاست آزاد ہے حرام وحلال کی تمیز لازمی ہے اللہ نے اس معاملہ میں واضح حدود متعین کر دی ہیں اور ان سے تجاوز نہیں ہو سکتا اس اصول معاشی ناانصافی ختم ہو جائے گی ریاست میں ان قوانین کا نفاذ ہوگا تو معاشی عدل اجتماعی طور پر قائم ہوگا۔

ہمارے دور میں ہر ریاست اپنا دستور قومی یا گروہی مفادات کے پیش نظر بناتی ہے دنیا میں آج جو کثیر الریاستی نظام قائم ہے اس کی موجودگی میں یہ توقع رکھنا کہ پائیدار امن قائم ہو سکے گا محض خام خیالی ہے۔

آج بھی دنیا میں امن وامان اور سلامتی کے لیے اقبال کے فکری نظریات کی عملی ضرورت ہے کیونکہ وہ ایک ایسے ریاستی نظام کی بنیاد پر زور دیتے ہیں جس کا دستور ساری نوع انسانی کی فلاح کے لیے وضع کیا جائے۔ اقبال کے نزدیک وطن پرستی انسان کی آزادی اور حقوق غصب کرنے کا دوسرا نام ہے۔ نسل اور وطن کے نام پر لوگوں کو تقسیم کر کے اس سے فائدہ اٹھانا مغربی سیاست دانوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ آج بھی اقبال کے نظریے کو دیکھیں تو یورپ میں موجودہ خلفشار اخلاقی بے راہ روی نسلی امتیاز صرف اور صرف قوم پرستی کی بدولت ہے آج امریکہ اور کئی علاقہ جات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ قوم پرستی Nationalism کا کیا دھرا ہے۔ جنوری ۲۰۱۶ء میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے بھی قوم اور نسل کے نام پر منافرت کو ہوا دی ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال زندگی کے ہر دور میں منافقت زدہ ذہنیت کی

مخالفت کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے آفاقی پیغام میں مسلم برادری کو یہ پیغام دیا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر
فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

جمہوریت سے بھی اقبال کو اختلاف وہیں پر ہوتا ہے۔ جہاں یہ جغرافیائی قومیت کے ساتھ وابستہ ہوگئی۔ کیونکہ اقبال کی مثالی ریاست ایک ایسی اسلامی ریاست ہے جس کا پیغام عالمگیر ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اقبال نے اپنی عمر کا ایک حصہ یورپ میں گزارا وہ کیمرج میں بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے رہے اور انہوں نے وہاں ایک استاد کی حیثیت سے فلسفے کا درس بھی دیا۔ علم کی پیاس انہیں ہائیڈل برگ بھی لے گئی اور وہاں بھی انہوں نے علمی مشاغل کو جاری رکھا۔ اور وہ مغرب کے فکر و فلسفہ پر پوری حاوی ہو گئے انہوں نے تقریباً تمام اہم مغربی ممالک کی سیاحت بھی کی اور اس طرح آ گئی مغرب اور مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا لیکن مغرب سے اس قدر قربت کے باوجود وہ اس سے کوئی ذہنی مطابقت پیدا نہ کر سکے۔ بل کہ شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ ان پر تو اس قربت نے الٹا اثر ڈالا اور وہ جیسے جیسے مغرب کے قریب ہوتے گئے۔ اس کی مخالفت کا ایک طوفان ان کی شخصیت میں موجزن ہونے لگا۔ اس صورت حال کا یہ اثر ہے کہ اقبال کے ہاں جابجا مغربی تہذیب و معاشرت کی تنقید کا ایک باقاعدہ اور مستقل رجحان ملتا ہے اور اس رجحان میں خاصی شدت نظر آتی ہے ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں اس

رجحان کی آئینہ دار ہیں۔

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی
مے خانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر
برانہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

مغرب اور مغربی تہذیب کے بارے میں اقبال کے یہ خیالات اس احساس وشعور نے پیدا کیے ہیں کہ مغرب کی تہذیب وثقافت گذشتہ کئی سو سال سے عقلیت اور مادیت کا دامن پکڑ کر زندگی کے راستے پر آگے کی طرف جا رہی ہے۔ اس نے زندگی پر حاوی ہونے اور اس کو قابو میں لانے کا کام تو انجام دیا ہے لیکن اس کی پرواز صرف مادی پہلوؤں تک ہے اور اس کو اس نے اپنا نصب العین بنالیا ہے۔ اس کے نتیجے میں مغربی تہذیب ایک عجیب قسم کے انتشار سے دوچار ہوئی۔ افراد وقوم میں محنت کا خاتمہ ہوگیا انسانیت خواب وخیال ہوگئی زندگی کا کوئی معیار باقی نہ رہا صرف مادی ترقی کے خیالات معیار بن گئے اور زندگی انہی معیاروں کی طرف دوڑنے لگی اس کا نتیجہ ہوس ممالک گیری کی صورت میں نمایاں ہوا خون ریز جنگیں زندگی کا جزو بن گئیں انسان کا خون پانی کی طرح بہنے لگا قومیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑی گئیں۔ اخوت اور آزادی کا تصور باقی نہ رہا۔ طبقات کی تفریق بڑھ گئی علوم میں اضافہ ضرور ہوا لیکن عرفان کی منزل سے ہمکنار نہ ہوا اور علم کی یہ ترقی خود انسانیت کے لیے خطرہ بن گئی اقبال نے مغرب کی تہذیب کو قریب سے دیکھا اور یہ دیکھنے پر مجبور ہوگئے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یورپ کی تہذیب انیسویں صدی میں انقلاب فرانس اور بیسویں صدی میں جس اشتراکی انقلاب سے دوچار ہے وہ اس صورت حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ اس انقلاب نے بعض مسائل کو یقیناً حل کیا لیکن اس سے کہیں زیادہ مسائل اس زندگی میں پیدا کر دیے خود اشتراکی انقلاب کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔

یورپی تہذیب کی بنیاد ولمت پر ہے یہ مادی زندگی اور کسب زر ہی کو زندگی کی معراج سمجھتی ہے جس کے باعث بے مروتی اور سنگدلی کو فروغ حاصل ہوا اور انسانی زندگی اور روحانی اقدار کی کوئی قیمت نہ رہی چنانچہ انسان اعتدال سے محروم ہو گیا جو ایک صحت مند معاشرے کے لیے ضروری ہے اقبال کو اہل یورپ سے شکایت ہے کہ انہوں نے ذہنی تربیت کے ساتھ دل کی قربت کی طرف توجہ نہ کی ظاہر پر ایسی نظر جمی کہ باطن نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تہذیب فرنگی مادی آسائشوں پر ایسی فریفتہ ہوئی کہ روحانی زندگی کے تقاضے پس پشت ڈال دیے اقبال کا عقیدہ ہے کہ خالص مادیت کی بنیادوں پر کسی تہذیب کو کبھی استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم ' یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

سائنسی ترقی نے مغرب کو مادی حیثیت سے غیر معمولی طاقت بخش دی اور اسے ظاہری شان و شوکت سے مالا مال کر دیا۔ لیکن انسانیت کے اصل جوہر کو نقصان پہنچایا اس کے علوم و فنون انسان کو حقیقی راحت ' آسودگی اور آرام بخشنے کے بجائے اس کی تباہی کا ذریعہ بن گئے اور اس مادہ پرستی نے یورپ کو انحطاط سے دوچار کیا۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام ' وائے تمنائے خام

مغرب میں اخلاقی اور روحانی اقدار سے روگردانی کا سبب یہ بنا کہ سائنس کے انکشافات قدم قدم پر ان کے جامد دینی عقائد سے ٹکراتے ہیں۔ روحانی اور اخلاقی اقدار کی غیر موجودگی میں مے خواری عریانی سود خوری اور اخلاقی پستی نے جنم لیا اور ان امراض نے یورپ کی تہذیب کو کھوکھلا کر دیا۔

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

دور جدید میں دیکھیے اقبال کے نظریات مغربی تہذیب کے بارے میں کتنے درست ثابت ہوئے مغربی تہذیب کے متعلق ''موبلز'' لکھتا ہے۔

''ساری قوت اور طاقت کا مقصد صرف ایک ہی ہے کہ جائزہ ناجائز طریقے سے مخالف کو شکست دی جائے ہماری تہذیب کے پیش کردہ اخلاقی قیود سے یکسر آزاد ہے''

اقبال مغربی تہذیب کے مادی نقطہ نظر پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اقبال مادی ترقی کے سرے سے مخالف ہیں اس معاملے میں ان کی صریح رائے یہ تھی کہ انسان کو مغرب کی طرح مادے کے سامنے نہ جھکنا چاہیے اور نہ ہی ترک دنیا کے طالب علموں کی طرح مادے سے انکار کر دینا چاہیے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اسلام کی اس روح سے آشنا ہو جائیں جو مادے سے گریز کے بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ تمہارا دنیا میں حصہ ہے اس کو نہ بھولو۔

علامہ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کے ایک اور بڑی خامی عقلیت پرستی ہے۔ جدید تمدن انسانی افعال و افکار کو عقل کے علاوہ کسی اور کسوٹی پر پرکھنے کے لیے تیار نہیں۔ جبکہ اقبال کے خیال میں عقل کے پاس حقیقت تک پہنچنے کا کوئی موزوں پیمانہ نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق محض حواس انسانی پر ہے اور حواس حقیقت کے ادراک کے لیے اکثر ناکافی ہوتے ہیں۔

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک
اگر مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک
عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل علیہ السلام

اس عقل پرستی کے ساتھ طبعی سائنس کی ترقی نے مل کر انسانیت کے لیے ہلاکت کے اسباب پیدا کئے ہیں۔

تاریخ انسانیت کے عظیم المرتیب عالم پروفیسر آرنلڈ جے ٹائن بی نے اپنے ایک مضمون میں تہذیب جدید کی ناکامی کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے History warns the Modren man:

''پوری تاریخ سے مجھے ایک ہی سبق ملتا ہے کہ یہاں کوئی چیز دنیاوی کامیابی سے بڑھ کر ناکام نہیں۔ اکیس تمدنوں کے مطالعے کے بعد میرا اس بات پر پختہ یقین ہو گیا ہے کہ تمدن اسی وقت تک صحت مند رہتے ہیں جب تک ان میں تخلیق کی قوت اور صلاحیت برقرار رہتی ہے۔ ہماری سائنسی ترقیات صنعتی دور کے چیلنج کا ایک تخلیقی جواب نہیں لیکن جو مسائل ہمیں درپیش ہیں وہ اس نوعیت کے نہیں کہ ان کا جواب تجربہ گاہوں میں دیا جائے یہ اخلاقی مسائل ہیں اور سائنس اخلاق کے دائرے میں کوئی دخل نہیں رکھتی اپنے مسائل کو خالص مادی تدابیر سے حل کرنے کی عیاری حالیہ مساعی ناکام ہو چکی ہیں اور ہمارے تمام بلند دعوے محض مذاق بن کر رہ گئے ہیں''

علامہ اقبال سمجھتے تھے کہ مذہب کے بغیر زندگی بے معنی ہو جاتی ہے کیونکہ انسان طرز فکر اور نظریہ حیات مذہب ہی سے لیتا ہے جس کا وہ پیروکار ہو یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری خواہ کسی موضوع

پر ہوا اس پر مذہب کا رنگ بڑا واضح نظر آتا ہے وہ اقوام جو بظاہر خدا پر یقین نہیں رکھتیں آخر کار وہ بھی لامرکزیت سے تنگ آکر کوئی مرکز ڈھونڈتی نظر آتی ہیں۔

پروفیسر آرنلڈ بی جے ٹائن بھی اپنے مذکورہ مضمون میں آگے لکھتے ہیں۔

''اپنی معاشرتی بیماریوں کو خدا کے بغیر حل کرنے کے نتائج ہمارے سامنے آچکے ہیں دور حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ایک فوق الطبعی ایمان کا احیا ہے۔''

علامہ اقبال مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھ کر سمجھ چکے تھے اسی لیے وہ اس کی ظاہری چمک دمک سے متاثر نہیں ہوتے اور یہ کہتے ہیں کہ

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

علامہ اقبال نے مسلمانوں کو رنگ و نسل' جغرافیے اور علاقائیت کے محدود اثرات بچانے کی کوشش کی اور اس کے خطرات سے آگاہ کیا مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ کرہ ارضی پر پھیلے ہوئے ساٹھ کروڑ مسلمان بحر بیکراں اور سہل بے پناہ بننے کے بجائے اپنے چھوٹے چھوٹے جغرافیائی خطوں میں جوئے کم آب بن کر رہ جائیں گے۔ایک طرف ۱۹۶۷ء سے مسجد اقصیٰ کی محرابوں سے دھواں اٹھ رہا ہوگا۔ دوسری طرف مسلمان ممالک میں طاؤس ورباب کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہوں گی۔ کرہ ارضی پر جگہ جگہ خون مسلم کی ارزانی ہوگی اور مسلمان سرمایہ دار سود خود یہودیوں کی طرح قارون بننے کی ہوس میں مبتلا ہوں گے۔ وہ نمائشی کاموں پر لاکھوں روپیہ خرچ کر دیں گے لیکن خاموش خدمت اور انفاق فی سبیل اللہ کے لیے معمولی رقم دینے کے لیے آمادہ نہ ہوں گے۔

میں خلوص دل اور دیانت داری سے دیکھنا چاہیے کہ ہمارے ہاں یہ تضاد کیسا ہے اور ہم اسے اس طرح دور کر سکتے ہیں۔اگر ہم واقعی رہنمائی چاہتے ہیں تو اقبال کا کلام زندگی کی شب تار میں منارہ نور کا حکم رکھتا ہے خود ان کے الفاظ میں

صفت برق چمکتا ہے مرا فکرِ بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی

علامہ اقبال کو ہم شاعر قوم کی حیثیت سے جانیں یا حکیم الامت کہیں۔ شاعر مشرق کہیں یا شاعر انقلاب ان کی شاعری میں کونسا پہلو ہے جو نظر نہیں آتا۔ سیاست میں، جمہوریت اشتراکیت، مذہب اخلاقیات عشق تصوف خودفنون لطیفہ مسئلہ اجتہاد مسئلہ جبر وقدر عالم اسلام کی محبت کا سبق، عورتوں کی تعلیم وتربیت کا پہلو.......... غرض کون سا مسئلہ ہے جس کا حل ان کے ہاں نظر نہیں آتا۔ انھوں نے بہت پہلے ہی آنے والے وقت کے مسائل کی بھی نشاندہی کر دی یہی وجہ ہے کہ اقبال کا نام جتنا کل روشن تھا اس سے زیادہ آج ہے کیونکہ اقبال کا پیام اللہ کا پیام ہے قرآن کا پیام ہے۔ جو ہر دور ہر عہد ہر زمانے کے لیے رہنما اصول فراہم کرتا ہے اور خدا کے نام لیوا جو اس کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچائیں کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ اقبال کا پیام کل بھی اتنا ہی مفید ہوگا جتنا کہ آج ہے ہم بجا طور پر اقبال کو آنے والا کل کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔

نکلسن نے کہا تھا "کہ اقبال اپنے عہد کی پیداوار تھے اور وہ اپنے عہد سے آگے بھی دیکھتے تھے"

اقبال ماضی کی شناخت رکھتے تھے انہیں تاریخ کا بھی شعور تھا لیکن وہ ماضی کے اسیر نہیں تھے بلکہ وہ حال و مستقبل کا بھی مکمل شعور رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ اقبال آج بھی اہم ہیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا آگے بڑھتا جائے گا ان کے شعور کے کچھ پہلو اور عصری سوتے جاگتے رہیں گے۔ اقبال کی فکری کائنات، مقصدیت کے گرد گھومتی ہے۔ اقبال نے قلم سے اس کائنات کو قوس قزح کے رنگ عطا کیے ہیں۔ ان کی شاعری کے تمام ادوار ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

اقبال ہر دل کی پکار ہے۔ انسانیت کا درد رکھنے والا ہر شخص اقبال کا ہم زبان ہے۔ اقبال نے ایم بی بی ایس ڈاکٹر کی طرح امت مسلمہ کا نہ صرف ایکسرے کیا بل کہ الٹرا ساؤنڈ کر کے امراض کی تشخیص کی۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اپنی بصیرت سے امت مسلمہ کے تمام امراض کا حل بھی تلاش کیا۔ حرکت و عمل کے گرد گھومتے ہوئے اشعار قومی ارتقاء کا پیغام دیتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ بات بڑی اہم ہے کہ پاک چین دوستی کا ثمر جونہی سی پیک کی صورت میں سامنے آیا تو حکومت مصر نے بھی اس میں شمولیت کی خواہش کا اظہار کیا۔ مصری حکومت کے اس اقدام سے اقبال کا یہ پیغام حقیقت کا روپ دھارتے نظر آتا ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم
۳۱۹ وائی علامہ اقبال کالونی سرگودھا
۰۴۸۔۳۷۱۱۷۱۷
drharoonsgd@gmail.com

۱۵ جنوری ۲۰۱۷ء بروز بدھ

ooo

حیات اقبال لمحہ بہ لمحہ

۹ نومبر ۱۸۷۷ء

علامہ محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بمطابق ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ بروز جمعۃ المبارک۔ بوقت اذان فجر سیالکوٹ کے محلہ چوڑی گراں میں پیدا ہوئے۔ کچھ ماہرین اقبالیات ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۳ء کے حق میں ہیں۔ اس تاریخ پیدائش کی درستی کے لیے بہت تحقیقات ہوئیں۔ شواہد کی روشنی میں ان کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء حتمی قرار دی گئی۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر اور ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب ''اقبال کی تاریخ ولادت، ایک مطالعہ'' دسمبر ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آئی، اس کتاب میں پندرہ مضامین اردو میں اور چار مضامین انگریزی زبان میں شامل ہیں۔ بزم اقبال اور حکومت پاکستان کی ایک کمیٹی ۱۹۷۲ء میں تشکیل دی گئی۔ اس کے کئی اہم اجلاس ہوئے۔ یکم فروری ۱۹۷۴ء کو کمیٹی نے فیصلہ دے دیا ۱۸ مارچ ۱۹۷۴ء بروز پیر وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے سرگودھا اسٹیڈیم میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے ۹ نومبر کی چھٹی کا حسب ضابطہ اعلان کیا۔ ۱۹۷۴ء کو پہلی مرتبہ ۹ نومبر کو یوم اقبال کی چھٹی کی گئی اور یوم اقبال پورے جوش و جذبہ سے منایا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ۲۵ جولائی ۱۹۷۴ء کو اعلان کیا کہ ۱۹۷۷ء کو اقبال کا صد سالہ جشن منایا جائے۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ضیاء الحق کا مارشل لاء لگ گیا اور یہ سال بھٹو کے بجائے ضیاء الحق نے منایا۔ ۲۰۱۵ء کے نومبر میں میاں نواز شریف کی مسلم لیگی حکومت نے یوم اقبال کی چھٹی منسوخ کر دی۔

محلہ چوڑی گراں جہاں اقبال پیدا ہوئے اب اس کا نام اقبال سٹریٹ رکھا گیا ہے۔ اقبال کی جائے پیدائش کی وجہ سے مکان کو ''اقبال منزل'' کا نام دیا گیا ہے۔ آج کل ''اقبال منزل'' کو آثار قدیمہ نے اپنے محیط میں لے رکھا ہے۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے۔ اقبال کے نوادرات تا حال اپنی اصل

حالت میں موجود ہیں۔عمارت خستہ ہوتی جا رہی ہے۔دوسری منزل کی بالکونی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔اس بالکونی سے پورا بازار نظر آتا ہے۔اقبال منزل آنے والوں کے لیے پارکنگ کا اہتمام نہیں ہے۔اب اس عمارت کو میوزیم کی شکل دے دی گئی اقبال منزل کو ایک گورنر باڈی چلا رہی ہے۔یہاں ایک لائبریری بھی قائم ہے۔جس میں اقبال سے متعلق لاتعداد کتب موجود ہیں۔علامہ محمد اقبال کے زیر استعمال اشیاء کو بڑے سلیقے سے محفوظ رکھا گیا ہے۔جہاں ہزاروں،بل کہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ تشریف لاتے رہتے ہیں۔علامہ محمد اقبال وہ نابغہ روزگار ہستی ہیں جن کی بدولت سیالکوٹ کو عالمی سطح پر پذیرائی نصیب ہوئی۔سیال کوٹ کی قسمت کو چار چاند لگے۔علامہ محمد اقبال نے نظم ونثر میں اتنا وقیع کام کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ان کی کتب کے تراجم غیر ملکی زبانوں میں ہوئے۔اپنوں کے علاوہ غیر ملکی ناقدین نے بھی اقبال کی عظمت کے گن گائے ہیں۔لاتعداد کتب اقبال کے فکروفن پر لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں اور یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔افکار اقبال بحرِ بے کراں ہیں جنھیں کسی ایک کتاب میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ان کے فکروفن پر ہر سطح کی تحقیق کے نئے زاویے سامنے آ رہے ہیں۔

سیال کوٹ :

عصر حاضر میں گوجرانوالہ ڈویژن اپنی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔پنجاب کے اہم ڈویژنوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔اس کے اضلاع میں گوجرانوالہ،سیال کوٹ اور گجرات شامل ہیں۔سیال کوٹ شہر اقبال کا درجہ رکھتا ہے۔سیال کوٹ کا رقبہ ۱۱۶۳ مربع میل،جب کہ شہری آبادی ۱۶ لاکھ پر مشتمل ہے۔جب کہ ضلعی آبادی ۳۲ لاکھ ہے۔اس کے شمال میں ضلع گجرات اور جموں کا علاقہ ہے۔جنوب میں بھارت کا ضلع امرتسر،مشرق میں ضلع گورداس پور اور مغرب میں ضلع شیخوپورہ اور ضلع گوجرانوالہ ہیں۔یہ ضلع پانچ تحصیلوں پر مشتمل ہے۔شکر گڑھ،نارووال،پسرور،ڈسکہ اور سیال کوٹ۔

سیال کوٹ بہت قدیم شہر ہے اسے پانڈو خاندان کے حکمران راجہ سل نے تعمیر کیا جس کا ذکر مہا

بھارت میں بھی موجود ہے۔ انہی کے نام کی نسبت اس کا نام سیال کوٹ پڑ گیا ہے۔ ایک تباہ کن سیلاب کی وجہ سے یہ علاقہ ایک ہزار برس تک غیر آباد رہا حتیٰ کہ راجا سمرت کے زمانے میں آبادی کے آثار دوبارہ نظر آئے ہیں۔ اس وقت سیال کوٹ کشمیر کا حصہ تھا۔ بعد میں یوجین کے بادشاہ بکرماجیت کے عہد میں راجہ سلوان نے سیال کوٹ میں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ راجہ سلوان کی وفات کے بعد پورن بھگت کا بیٹا راجہ رسالو تخت نشین ہوا ۳۶۰ء کے قریب گکھڑ قبائل نے ایک بڑی فوج سے سیال کوٹ فتح کرنا چاہا، لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ راجہ رسالو کے انتقال کے بعد یہاں تین سو سال تک لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ ۹۷۰ء میں نیروت نے یوسف زئی قبائل کی مدد سے سیال کوٹ شہر اور قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے بعد یہ علاقہ جموں کے راجا براہم دیو کے زیر نگیں آ گیا۔ ۱۱۸۴ء میں شہاب الدین غوری نے اس پر حملہ کیا۔ ۱۵۲۰ء میں بابر نے جب سیال کوٹ کے راستے ہندوستان پر چڑھائی کی تو خسرو کوکلتاش کو سیال کوٹ کا گورنر مقرر کیا۔ شاہ جہاں کے عہد میں یہ علاقہ علی مردان خان کے زیر انتظام رہا۔ ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ درانی نے اس پر قبضہ کر لیا پھر یہ سکھوں کی عمل داری میں رہا۔ رنجیت سنگھ کے بعد انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ان کے چنگل سے آزاد ہوا۔

آزادی کے بعد سیال کوٹ نے بہت ترقی کر لی۔ یہ شہر صنعتی لحاظ سے جدید شہر بن گیا ہے کپڑے، کھیلوں کے سامان، چمڑے کی مصنوعات، بچوں کے کھلونے، اسٹین لیس سٹیل کے برتن، ہلکا اسلحہ اور آلات جراحی بنانے کے بے شمار چھوٹے بڑے کارخانے قائم ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر کھیلوں اور آلات جراحی کی وجہ سے سیال کوٹ کا نام بہت مقبول ہوا ہے اور اسے کروڑوں روپے کا زرمبادلہ بھی حاصل ہو رہا ہے۔

شہر میں بابا گرونانک کا گردوارہ "بابے دی بیری" کے نام سے معروف ہے جہاں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں سکھ یاتری لگنے والے میلہ میں شریک ہوتے ہیں۔ مشہور صوفی بزرگ حضرت علی الحق امام صاحب کا مزار بھی یہیں ہے۔ یہ شہر علمی و ادبی لحاظ سے بھی بہت زرخیز ثابت ہوا ہے کہ یہاں مغلیہ

دور میں ملا کمال کشمیری، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، شمس العلماء مولانا میر حسن، مولانا غلام حسن اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کے علاوہ حضرت علامہ محمد اقبال کو عالم گیر شہرت نصیب ہوئی۔ عصر حاضر میں فیض احمد فیض، غلام الثقلین نقوی، آثم مرزا، پروفیسر اصغر سودائی، جاوید اقبال (کارٹون ساز) اسلم کمال، ممتاز حمید، بختیار احمد، ظہیر عباس (کرکٹ) شہناز شیخ اور منظور جونیئر (ہاکی) بھی سیال کوٹ کے سپوت ہیں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں چونڈہ سیکٹر میں لازوال قربانیوں، شجاعت اور بہادری کے صلے میں اس شہر کو "ہلال استقلال" عطا ہوا۔ سیالکوٹ میں بازار کلاں، صرافہ بازار، لوہاراں بازار، مسلم بازار، ٹرنک بازار، مشہور ہیں۔ محلوں میں پلاشا گیٹ، سرائے بھابڑیاں، کشمیر محلہ، محلہ کھٹیکاں، محلہ خراسیاں، محلہ شاہ سیداں اور محلہ واسی شہیداں قدیم طرز کے محلے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کئی نئے محلے آباد ہوئے جو اب شہر میں ضم ہو چکے ہیں۔ کئی نئی آبادیاں اور ٹاؤن آباد ہو رہے ہیں۔

سیال کوٹ میں واقع پاکستان کے قدیم ترین قلعوں میں سے ایک قلعہ۔ اسے دو ہزار سال قبل راجہ سالباہن نے تعمیر کرایا، اس قلعے کے اب کھنڈرات ہی اس کی باقیات ہیں۔

اقبال کے آباؤ اجداد:

مغلیہ دور حکومت میں کشمیر ایسی حسین وادی میں لاتعداد برگزیدہ ہستیاں اور صوفیا کرام تشریف لائے۔ جنھوں نے وہاں اشاعتِ اسلام کا کام بڑے زور وشور سے کیا۔ اپنے حسن عمل اور حسن اخلاق سے ہندوؤں کے دل موہ لیے۔ ہندو آہستہ آہستہ ان برگزیدہ ہستیوں کے گرویدہ ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ ۱۶۵۰ء کے قریب سری نگر سے اقبال کے مورث اعلیٰ ان کی زیارت کے لیے سری نگر آئے اور اس بزرگ ہستی کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنا نام صالح تجویز کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صابر کلوروی لکھتے ہیں:

"اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کا کیا نام تھا؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ

نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ہمیں اتنا ضرور معلوم ہے کہ اسلام اقبال کرنے کے بعد ان کا نام صالح رکھا گیا۔ صالح نے اس مرد قلندر کی تربیت میں روحانیت کی کئی منزلیں طے کیں اور بابا صالح کے نام سے مشہور ہوئے۔ سید صاحب نے ان کے تقویٰ سے متاثر ہو کر اپنی دختر نیک اختر کا نکاح بھی ان سے کر دیا ان کا مزار کشمیر میں ہی کسی جگہ موجود ہے۔" ۱

بابا صالح سے لے کر علامہ محمد اقبال تک چھ پشتیں درمیانی کڑی کا حصہ ہیں۔ ان میں سے دو شیخ نور محمد کے جد امجد شیخ جمال الدین تک، دو پشتیں ایسی گزری ہیں جن کے بارے میں تاریخ خاموش ہے اور ان کے بارے میں کہیں سے بھی کوئی معلومات دستیاب نہ ہے۔ علامہ اقبال کے اجداد میں سے ایک بزرگ "لول حج" یعنی "حج کا عاشق" کے نام سے معروف ہوئے۔ بابا لول حج کشمیر کے معروف مشائخ میں سے ایک تھے۔

علامہ محمد اقبال کشمیری خاندان ۔ سے تعلق رکھتے تھے جو ڈھائی سو سال پیش تر سترہویں صدی عیسوی میں دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ یہ خاندان برہمن تھا اور ان کی گوت سپرو تھی اور یہ لوگ سری نگر میں رہتے تھے۔ اس حوالے سے عبدالمجید سالک لکھتے ہیں۔

"علامہ اقبال ایک کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے جو آج سے کوئی ڈھائی سو سال پیش تر سترہویں صدی عیسویں میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ یہ خاندان برہمن تھا، اس کی گوت سپرو تھی، یہ لوگ سری نگر میں رہتے تھے اور اپنی نیکی اور شرافت کی وجہ سے ہم چشموں میں معزز و ممتاز تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی سید بزرگ کہیں باہر سے سری نگر تشریف لائے، علامہ کے جد اعلیٰ ان کی پاک نفسی کے باعث ان کے گرویدہ ہو گئے۔ صحبت و محبت نے اپنا کام کیا۔ برہمن نے سید کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، صالح نام پایا" ۲

گم شدہ کڑیوں میں سے ایک کڑی شیخ اکبر بھی ہے جس کا ذکر اقبال نے بھی کیا ہے اور سید نذیر نیازی کے ہاں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ شیخ اکبر "باہالول حج" اور شیخ جمال الدین کی ایک درمیانی گم شدہ کڑی معلوم ہوتی ہے۔ شیخ اکبر علی اعلیٰ پائے کے مشائخ اور پیر مشہور ہوئے۔ ان کے ارادت مندوں کی تعداد خاصی ہے۔ شیخ اکبر علی چکو پرگنہ اڈرن سے ہجرت کر کے سن کھترا (سیال کوٹ) سکونت پذیر ہو گئے تھے یا واپس چلے گئے اس بارے میں بھی کوئی زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرائن قیاس ہے کہ علامہ محمد اقبال کے پڑدادا شیخ جمال الدین، شیخ اکبر علی کی اولاد ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صابر کلوروی رقم طراز ہیں:

> "علامہ اقبال کے والد محترم کے دادا شیخ جمال الدین تھے۔ اگر شیخ اکبر کو ہم مستند معلومات کی روشنی میں ایک صحیح کڑی مان لیں تو پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ انھی کے فرزند تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ شیخ عبدالرحمٰن، شیخ محمد رمضان، شیخ محمد رفیق اور شیخ محمد عبداللہ۔ اقبال کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ شیخ جمال الدین نے یا ان کے چار بیٹوں نے اٹھارویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہجرت کی۔ یہ ہجرت ۱۸۱۹ء یا ۱۸۲۰ء میں ہوئی ہوگی۔ آباؤ اجداد کی سرزمین سے ہجرت کرنے میں ضرور کسی مہتم بالشان واقعہ کا ہاتھ ہوگا۔" ۳۔

تاریخ کے اوراق پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ کشمیر پر حملہ آور ہوا رنجیت سنگھ نے ۲۷ برس کشمیر پر حکمرانی کی جس کا پایہ تخت لاہور تھا۔ رنجیت سنگھ کا دور ظلم و جور اور کرب ناک اور پر تشدد تھا۔ مسلمانوں پر مظالم کی انتہا کر دی گئی۔ مسلمان اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے کھیتی باڑی ترک کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سخت قحط پڑا۔ لوگ درختوں کے پتے اور جڑوں پر گزر بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے ظلم و بربریت کی وجہ سے کئی خاندان کشمیر سے نقل مکانی پر مجبور ہوئے اسی

ظلم وجور سے تنگ آ کر کے علامہ محمد اقبال کا خاندان بھی ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ وہاں سے ہجرت کر کے سیال کوٹ آباد ہو گیا۔ شیخ جمال الدین کے بیٹوں میں شیخ عبدالرحمٰن اور شیخ محمد رفیق سیال کوٹ سکونت پذیر ہوئے جب کہ ان کے ایک بیٹے شیخ محمد عبداللہ موضع "جیٹھی" میں ہی رہائش پذیر رہے۔ ان بھائیوں کی اولادیں آج بھی سیال کوٹ اور موضع جیٹھی میں موجود ہیں۔ شیخ محمد رفیق کو اللہ تعالیٰ نے دو صاحبزادوں شیخ نور محمد اور شیخ غلام قادر (جو محکمہ انہار میں ملازم تھے جن کا انتقال روپڑ (ضلع انبالہ) میں ہوا) سے سرفراز کیا۔ شیخ محمد رفیق اپنے بیٹے شیخ غلام قادر کو ملنے روپڑ گئے تو وہاں ہیضہ کی وباء میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے اور وہیں ضلع انبالہ روپڑ میں دفن ہوئے۔ غلام قادر کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی جب کہ دو لڑکیاں پیدا ہوئیں جن کی اولاد آج بھی سیال کوٹ میں آباد ہے۔

اقبال کے والد گرامی:

علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد (۱۸۳۶ء۔ ۱۹۳۰ء) زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ علامہ اقبال کے دادا حضور شیخ محمد رفیق اور علامہ اقبال کے پڑدادا جمال الدین انیسویں صدی کے آغاز میں کشمیر چھوڑ کر سیال کوٹ ہجرت کر آئے۔ یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ اقبال کی پیدائش سے پہلے ان کے والد شیخ نور محمد کو اقبال کی عظمت کے حوالے سے خواب میں بشارت مل چکی تھی۔ شیخ نور محمد نے دیکھا کہ ایک خوب صورت کبوتر ہوا میں کچھ دیر اڑتا رہا اور لوگ اس کبوتر کو حیرانی سے دیکھتے رہے کہ اچانک وہ کبوتر شیخ نور محمد کی آغوش میں آ گرا۔ کسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اقبال عظمتِ انسانی کے مبلغ اور شعر و فلسفہ کے خزینہ دار بن کر آفتابِ حکمت و دانائی ثابت ہوں گے۔

علامہ محمد اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق جو عرف عام میں شیخ رفیقا کہلاتے تھے۔ کشمیری دھسوں اور لوئیوں کی تجارت کرتے۔ اس کام میں شیخ نور محمد اپنے والد کا ہاتھ بٹانے لگے۔ بعد میں برقعوں کی ٹوپیاں بنانے لگے یہ کاروبار بہت منافع بخش ثابت ہوا۔ ان کی ایمان داری اور حسن اخلاق کا

بہت شہرہ پھیلا۔ان کی شرافت کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں۔

''اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق دُھسوں اور لوئیوں کی تجارت کرتے تھے۔شیخ نور محمد اوائل عمری میں ہی اس کام میں والد کا ہاتھ بٹانے لگے اور پھر رفتہ رفتہ یہی کاروبار کلیتاً سنبھال لیا۔اس کے ساتھ وہ برقعوں کی ٹوپیاں بھی تیار کرنے لگے۔ خدا نے کاروبار میں برکت دی اور ان کی مالی حالت بہتر ہوگئی ۔ برادری محلے والے انھیں ''میاں جی'' کہتے تھے ۔شیخ نور محمد نے برادری ، اپنے محلے اور کاروباری حلقوں میں اپنی دیانت وشرافت اور معتدل مزاجی کی وجہ سے ایک اخلاقی ساکھ بنالی تھی ۔اس وجہ سے انھیں ہر جگہ عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔خدمتِ خلق اور کسب حلال کے لیے ان کی محنت اور جدوجہد نے ان کے اندر ایک طرح کی روحانیت پیدا کردی تھی جس نے ان کی شخصیت کو بہت دل کش اور دل نواز بنادیا تھا۔'' [۲]

شیخ نور محمد کے بڑے صاحبزادے شیخ عطا محمد ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ان کے شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں فوج میں بھرتی کروادیا۔شیخ عطا محمد نے تھامسن انجینئرنگ کالج رڑکی (یوپی۔انڈیا) سے سند حاصل کی اور ملٹری ورکس میں بطور سب اوورسیئر ۲۸ سال ملازمت کی ۔ اقبال کے تعلیمی اخراجات بھی اٹھاتے رہے۔شیخ نور محمد کے ہاں ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو محمد اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔شیخ نور محمد نے اقبال کی تعلیم وتربیت کا خاص اہتمام کیا اور ان کی دیکھ بھال پر خصوصی توجہ دی۔

شیخ نور محمد کی شباہت اور شادی کے حوالے سے ڈاکٹر صابر کلوروی رقم طراز ہیں:

''شیخ نور محمد قد کاٹھ اور شکل وصورت کے اعتبار سے نمایاں شخصیت کے حامل تھے ان کی شادی موضع سمبڑیال (ضلع سیالکوٹ) کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی۔شادی کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان کے سسرال والے بھی سیالکوٹ

میں سکونت پذیر ہو گئے شیخ نور محمد کو عرف عام میں "نتھو" کہتے تھے۔" ۵

قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے اقبال کو دیکھا تو شیخ نور محمد فرمانے لگے بیٹا قرآن کو ایسے پڑھا کرو جیسے یہ آپ پر اتر رہا ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات والد صاحب کی باتوں سے سمجھ میں آئی کہ قرآن پاک دل کے راستے بھی انسانی شعور میں داخل ہوتا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے والد گرامی کی نصیحت پر ایسے عمل کیا کہ قرآن کو پڑھا ہی نہیں بل کہ اپنے اندر جذب کرنے کی سعی کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ اقبال جب تلاوت قرآن پاک کر رہے ہوتے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اتنے آنسو بہتے کہ قرآن کے "اوراق" بھیگ جاتے۔ پھر انہیں دھوپ میں خشک کیا جاتا۔ کلام اقبال کا بیشتر حصہ قرآنی آیات، قرآنی تلمیحات، قرآنی آیات کے تراجم اور قرآن سے اخذ شدہ ہے۔ علامہ محمد اقبال کی شاعری کا ماخذ قرآن پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلام اقبال کو پڑھنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اقبال کے والد محترم شیخ نور محمد ۱۷ اگست ۱۹۳۰ کو انتقال کر گئے۔

اقبال کی والدہ ماجدہ:

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شیخ نور محمد کی شادی سمبڑیال ضلع سیال کوٹ کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ امام بی بی کو "بے جی" کہا جاتا تھا۔ اُن کی والدہ ماجدہ امام بی بی نے "محمد اقبال" نام تجویز کیا سلیقہ شعار، دین دار، مشرقی روایات کی امین امام بی بی نے علامہ اقبال کی پرورش رزق حلال سے کی۔ وہ نیک سیرت اور صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ عظیم ماں نے اقبال کی تربیت کا خاص خیال رکھا۔ انھوں نے جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ اقبال کی روحانی تربیت کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ وہ اپنے غریب رشتہ داروں کی بچیوں کو اپنے گھر لے آتیں اور ان کی پرورش کرتیں، انہیں کھانا پکانا، سینا پرونا، کے علاوہ دینی تعلیم بھی دیتیں۔ انہیں روزہ و نماز کی پابند بناتیں۔ ان کی شادیاں بھی ایسے کرواتیں جیسے ان کی اپنی بیٹیاں ہوں۔

اس حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> "اقبال کی والدہ امام بی بی عرف بے جی (وفات: ۱۹۱۴ء) ایک نیک دل، معاملہ فہم اور قدیم وضع کی سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ کبھی محلے کی خواتین کے درمیان کسی مسئلے پر اختلاف ہو جاتا تو بے جی اتنی خوش اسلوبی سے فیصلہ کرتیں کہ فریقین مطمئن اور خوش ہو جاتے۔ غریب پرور تھیں۔ اپنے محلے یا برادری کے غریب مگر شریف گھرانوں کی دس بارہ سال کی تین چار بچیوں کو گھر لے آتیں، ان کی پرورش کرتیں، انھیں گھر کے کام کاج مثلاً کھانا پکانا اور سینا پرونا وغیرہ سکھاتیں۔ اسی طرح قرآن پاک اور نماز کی تعلیم بھی دیتیں۔ پھر کچھ مدت کے بعد مناسب رشتے تلاش کر کے ان بچیوں کا بیاہ کر دیتیں اور اپنی بیٹیوں کی طرح رخصت کرتیں۔" ۶

بے جی، انتہائی رحم دل اور خدا ترس خاتون تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غریب رشتہ داروں کی مالی اعانت بھی کرتی رہتیں۔ انھوں نے اقبال کے کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ دی۔ ایسی مائیں ہوں تو اقبال ایسے سپوت جنم لیتے ہیں۔ علامہ اقبال کی والدہ ماجدہ ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو ۷۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ اقبال نے اپنی شخصیت پر والدہ کے اثرات کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ اقبال اپنی والدہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ یورپ میں تھے تو ان کی والدہ ان کے خطوط کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتیں۔ والدہ محترمہ کے انتقال پر علامہ محمد اقبال نے جو مرثیہ بعنوان "والدہ مرحومہ کی یاد میں" لکھا اور بانگ درا میں شامل ہے۔ اس مرثیہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اسی زنجیرِ عالم گیر میں ہر شے اسیر

پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ! یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے

بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

تخم جس کا تُو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

شعلہ یہ کم تر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا

آہ ، یہ ضبط فغاں غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہے یہ دل آسائی ، فراموشی نہیں

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

مختلف ہر منزل ہستی کی رسم، و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

ہے وہاں بے حاصلی کی کشتِ اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے

نورِ فطرت ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں
تنگ ایسا حلقۂ افکارِ انسانی نہیں

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(والدہ مرحومہ کی یاد میں "بانگِ درا")

"والدہ مرحومہ کی یاد میں" بلاشبہ اقبال کی بہترین اور طویل نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم میں علامہ محمد اقبال کا والدہ ماجدہ سے بے پناہ محبت اور والہانہ لگاؤ کا ذکر ملتا ہے۔ اس نظم کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

"یہ نظم اقبال نے اپنی والدہ ماجدہ کی وفات پر ان کی یاد میں لکھی۔۔۔۔ اسے مرثیہ بھی کہا جاتا ہے۔ اولین شکل میں اس کے گیارہ بند اور ۸۹ اشعار تھے۔

"بانگ درا" کی ترتیب کے وقت علامہ نے اس میں سے کئی اشعار حذف کر دیے اور چند شعروں کا اضافہ بھی کیا۔ بندوں کی ترتیب بھی بدل دی۔ موجودہ شکل میں نظم کل تیرہ بندوں کے چھیاسی اشعار پر مشتمل ہے۔" ۷

"والدہ مرحومہ کی یاد میں" علامہ محمد اقبال کی چند طویل نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ نظم انھوں نے اپنی والدہ ماجدہ کی رحلت پر لکھی اور اس میں مرثیہ کا عنصر غالب ہے۔ تمام اشعار فرط جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اردو ادب کے معروف نقاد سید وقار عظیم اس نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"والدہ مرحومہ کی یاد میں" اقبال کی ایک ایسی نظم ہے جس میں اقبال کی شخصیت دو مختلف اندازوں میں جلوہ گر ہوئی۔ ایک شخصیت تو اقبال کی وہی فلسفیانہ شخصیت ہے جس کی بدولت اقبال کو اردو شاعری میں ایک منفرد حیثیت ملی ہے اور دوسری شخصیت اس مغموم و مجبور انسان کی ہے جو ماں کی یاد میں آنسو بہاتے وقت یہ بھول جاتا ہے کہ وہ ایک مفکر اور فلسفی بھی ہے۔" ۸

اقبال کی تعلیم و تربیت :

علامہ محمد اقبال کی ابتدائی تعلیم قدیم طرز کے مدارس میں ہوئی۔ پہلے پہل انھیں روایتی انداز کے مکتب میں بٹھایا گیا یہ مکتب مولانا غلام حسن کا تھا۔ مولانا میر حسن کی فرمائش پر ان کے مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد مولانا میر حسن نے خود ہی شیخ نور محمد کو مشورہ دیا کہ اب بچے کو سیالکوٹ کے سکاچ مشن اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ ۱۸۸۷ء پرائمری کا امتحان سیال کوٹ سے پاس کیا، سکاچ مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۸۹۱ء سکاچ مشن ہائی اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونی ورسٹی سے اینگلو مڈل اسکول کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ۱۸۹۳ء میٹرک کا امتحان دینے کے لیے گجرات گئے اور

امتحان میں درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔امتحان میں رول نمبر ۸۸۰ تھا اور حاصل کردہ نمبر ۴۲۳ تھے۔انھیں بارہ روپے ماہوار وظیفہ بھی حاصل ہوا۔ان کے مضامین انگریزی، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ، فارسی اور عربی تھے گجرات کے سول سرجن خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد خان کی بیٹی کریم بی بی سے شادی ہوئی۔بارات لے جانے سے پہلے انھیں میٹرک کے نتیجے کا پتا چلا۔۱۸۹۵ء سکاچ مشن کالج (مرے کالج) سیال کوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔

سکاچ مشن ہائی سکول میں انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں کھل گئی تھیں اور اس کا نام سکاچ مشن کالج ہو گیا تھا۔علامہ محمد اقبال نے میٹرک کرنے کے بعد ایف اے میں اسی کالج میں داخلہ لے لیا۔اس وقت سکول اور کالج میں درج ذیل اساتذہ موجود تھے (۱) ماسٹر غلام علی (اقبال شیدائی کے والد گرامی)، (۲) ماسٹر پالا مل، (۳) منشی امام الدین، (۴) مولانا سید میر حسن، (۵) مسٹر ڈیوڈ ہیڈ ماسٹر، (۶) ماسٹر ٹہل سنگھ (عیسائی) (۷) مسٹر وی ڈی سنگھا (جو بعد میں بیرسٹر ہو گئے) (۸) پادری ینگسن (سکاچ مشن)، (۹) جارج واخ پرنسپل سکاچ مشن کالج شامل تھے۔اسی زمانہ میں اقبال شعر گوئی کی طرف مائل ہو چکے تھے اس حوالے سے عبدالمجید سالک اپنی کتاب میں خان بہادر محمد مسیح پال کا بیان درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خان بہادر محمد مسیح پال کا بیان ہے کہ اقبال کالج کی کلاسوں میں پڑھتے تھے اور میں سکول میں تھا، مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ وہ سکول کے ایک جلسے میں شریک ہوئے اور اپنی نظم پڑھی۔'' 9

عربی زبان میں پنجاب یونی ورسٹی میں اول آئے۔ان کے ایف اے کا رول نمبر ۳۸۳ تھا جب کہ حاصل کردہ نمبر ۲۷۶ تھے۔انگریزی، ریاضی، فلسفہ اور عربی ان کے مضامین تھے۔گورنمنٹ کالج لاہور (گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور) میں بی اے میں داخلہ لیا۔بی اے میں عربی، فلسفہ اور انگریزی مضامین تھے ۱۸۹۷ء بی اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔عربی کے مضمون میں اول آنے پر پنجاب یونی ورسٹی نے خان بہادر ایف ایس جلال الدین میڈل عطا کیا۔۷ مئی ۱۸۹۷ء کو انھوں نے یہ امتحان ۲۶۰ نمبر حاصل

کر کے پاس کیا۔ اسی سال ہی گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے فلسفہ میں داخلہ لیا اور پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ سے یہیں پہلی ملاقات ہوئی ۱۸۹۹ء پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے فلسفہ کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔

پہلی شادی :

حضرت علامہ محمد اقبال کے میٹرک کے امتحان کا نتیجہ نہیں آیا تھا کہ علامہ محمد اقبال رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ ان کی شادی خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد خان کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان کا نکاح حافظ امام بی بی کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا، رخصتی بعد میں ہوئی۔ علامہ اقبال کے میٹرک کا نتیجہ بھی شادی والے دن انہیں موصول ہوا۔ یعنی اقبال کو ایک دن دو خوشیاں نصیب ہوئیں۔ ان کی یہ شادی زیادہ دیر نہ چل سکی ایک بچی مریم پیدا ہوئیں جو بعد میں انتقال کر گئیں اور آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ اس حوالے سے عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

> "ابھی انٹرنس کے امتحان کا نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ اقبال زنجیر ازدواج میں جکڑ دیے گئے۔ گجرات میں ایک دولت مند بزرگ خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد خان رہتے تھے، ان کی بڑی صاحب زادی سے رشتہ طے پایا۔ جب برات سیال کوٹ سے گجرات جانے کے لیے تیار ہوئی، سہرا بندھ گیا، اقبال گھوڑے پر سوار ہو گئے تو پاس ہونے کی خوش خبر کا تار آیا۔ اقبال کی پہلی شادی ناکام ہوئی اگرچہ انھوں نے نباہ کی بے حد کوشش کی اور اس بیوی سے ایک لڑکی مریم (مرحومہ) اور ایک فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔" ؂۱

عبدالمجید سالک کے بیان کے مطابق ان کی پہلی بیوی کریم بی بی سے ایک بچی مریم اور آفتاب اقبال پیدا ہوئے اور پھر بعد میں یہ رشتہ زیادہ دیر نہ چل سکا اور ان میں علیحدگی ہو گئی۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

اس حوالے سے کہتے ہیں:

"اقبال اور ان کی بیوی کریم بی بی (۱۸۷۴ء۔۱۹۴۷ء) کے درمیان دلی قربت او رمودت ومؤانست کا وہ تعلق کبھی نہ قائم ہوا جو ایک خوش گوار ازدواجی زندگی کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ اس درمیان ۱۸۹۶ء میں کریم بی بی سے معراج بیگم (وفات: ۱۹۱۵ء) تولد ہوئیں، پھر ۱۸۹۸ء میں اس کے بھائی آفتاب اقبال (وفات :۱۹۷۹ء) پیدا ہوئے۔ مگر صاحب اولاد ہونے کے بعد بھی، میاں بیوی میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی اور اس کا بنیادی سبب زوجین کا اختلاف مزاج وطبائع تھا۔" [11]

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کریم بی بی سے ایک بچی معراج بیگم اور ایک بچہ آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ مگر عبدالمجید سالک کا بیان الجھا دینے والا ہے کہ ایک بچی مریم (مرحومہ) پیدا ہوئیں اور پھر آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ دیگر کتب میں بھی بچی کا نام معراج بیگم ہی درج ہے۔ مگر مریم کا نام عبدالمجید سالک نے کہاں سے لیا خدا جانے۔؟ یہاں قاری کافی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے کہ آخر مریم کون تھیں؟ یوں لگتا ہے کہ ان سے سہواً معراج بیگم کے بجائے مریم لکھا گیا ہو۔ کیوں کہ کریم بی بی کے بطن سے ایک بچی اور ایک بچے نے ہی جنم لیا تھا۔ اور ان کے نام بھی مختلف کتابوں میں درج ہیں۔

اقبال کی لاہور آمد:

حضرت علامہ محمد اقبال نے سکاچ مشن سکول سیال کوٹ سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد یہیں سے ایف اے بھی پاس کیا۔ سکاچ مشن کالج میں ابھی تک بی اے کی کلاسز کا اجراء نہیں ہوا تھا اس لیے علامہ محمد اقبال ۱۸۹۵ء میں لاہور تشریف لے آئے جہاں انھوں نے بی اے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ تاخیر سے لیا جس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ انہیں کالج ہاسٹل میں داخلہ نہ مل سکا۔ بی اے سال دوم میں

انہیں کالج ہاسٹل کواڈرینگل میں داخلہ مل گیا (کواڈرینگل ہاسٹل کا نام بعد میں اقبال ہاسٹل کر دیا گیا) کواڈرینگل کا کمرہ نمبر ا انہیں مل گیا۔ بی اے میں علامہ اقبال کے مضامین انگریزی، فلسفہ اور عربی تھے۔ اس حوالے سے معروف ماہر اقبال اور میرے استاد گرامی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

"دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال بیک وقت گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج دونوں کے طالب علم تھے۔ ان کے مضامین انگریزی، فلسفہ، اور عربی تھے۔ چوں کہ گورنمنٹ کالج میں عربی کی تدریس کا الگ انتظام نہ تھا، اس لیے وہ اورینٹل کالج کی عربی کلاس میں شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج، گورنمنٹ کالج ہی کی عمارت میں چل رہا تھا۔" ۱۲

۱۸۹۷ء میں علامہ محمد اقبال نے بی اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا اور عربی میں اول آنے پر وظیفے کے علاوہ سونے کے دو طلائی تمغے (خان بہادر، فقیر سید جمال الدین میڈل) بھی حاصل کیے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے فلسفہ میں ایم اے کرنے کا فیصلہ کیا اور جہاں علامہ اقبال کو سر ٹامس آرنلڈ ایسے فاضل استاد سے اکتساب فیض کا موقع میسر آیا۔ ٹامس آرنلڈ علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے تھے جہاں وہ فلسفہ کے پروفیسر تعینات ہوئے تھے۔ کچھ ہی عرصہ میں ٹامس آرنلڈ کو اقبال کی مخفی صلاحیتوں کا علم ہوا وہ ان سے بے حد متاثر ہوئے اور اقبال کے ساتھ دوستانہ رویہ اپنا لیا وہ اقبال سے نہایت شفقت سے پیش آتے اور دیگر اساتذہ اور طلباء سے اقبال کے بارے میں گفت گو بھی کرتے رہتے۔ جہاں شاگرد کو پڑھنے کا جنون اور استاد کو پڑھانے کا جذبہ ہو وہاں پڑھائی سے جذبہ عشق بیدار ہو جایا کرتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی پروفیسر آرنلڈ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پروفیسر آرنلڈ خالص علمی مزاج کے حامل شخص اور سرتاپا ایک علم دوست انسان تھے۔ اپنے طالب علموں کو کتب بینی کی رغبت دلاتے، مطالعے کے لیے کتابیں

تجویز کرتے، بعض موضوعات سمجھاتے اور پھر ان موضوعات پر اپنے شاگردوں
سے تبادلۂ خیال بھی کرتے۔ اقبال سے ان کا برتاؤ استاد کے ساتھ ساتھ، ایک
دوست کی سطح کا بھی تھا۔ انھوں نے اقبال جیسے جوہر قابل کو اس طرح چمکایا کہ خود
آرنلڈ کو کہنا پڑا کہ ایسا شاگرد محقق کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔ اورینٹل کالج میں
بھی انھیں آرنلڈ کی علمی صحبت میسر رہی اور پھر انگلستان کے زمانۂ قیام میں بھی
آرنلڈ سے ان کا رابطہ برابر قائم رہا۔ علمی تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور جیسا کہ شیخ
عبدالقادر نے بانگ درا'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں اقبال نے
شاعری ترک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا مگر آرنلڈ کی وجہ سے وہ ترک شعر کے
ارادے سے باز آ گئے۔'' ۱۳

ٹامس آرنلڈ نے اقبال کو مشفقانہ انداز میں فلسفہ کی ایسی تعلیم دی کہ اقبال نے اسے نہ صرف سمجھا بلکہ پوری دنیا کو بتا دیا کہ فلسفہ ایسے پڑھا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنا اور اپنے استاد کا نام امر کر دیا۔ ٹامس آرنلڈ علی گڑھ میں دس برس تک فلسفے کے معلم رہے اس دوران انھوں نے مولانا شبلی نعمانی سے عربی کی تعلیم بھی حاصل کی، اس کے علاوہ انہیں اسلامیات اور تاریخ سے بھی گہرا شغف تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب Legacy of Islam اس بات کا بین ثبوت ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ''میراث اسلام'' کے نام سے منصۂ شہود پر آئی اس کا اردو ترجمہ عبدالمجید سالک نے کیا تھا۔

عبدالمجید سالک رقم طراز ہیں:

''پروفیسر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں
فلسفے کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے ایک تو اقبال کا اپنا رجحان فلسفے کی طرف تھا اس پر
آرنلڈ جیسے نامور فلسفی کی شاگردی کا موقع ملا'' ۱۴

علامہ محمد اقبال نے ایم اے فلسفہ ۱۸۹۹ء میں پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں اول آئے اور ایک بار

پھر طلائی تمغہ کے حق دار ٹھہرے۔

کواڈرینگل ہاسٹل کا کمرہ نمبر ۱ علمی وادبی حوالے سے بہت معروف ہوا۔ کیوں کہ اس کمرے میں علامہ محمد اقبال مقیم رہے۔ یہاں علم دوست طالب علموں کے علاوہ ان کے دوستوں کے جمگھٹوں اور شعرو شاعری کا مرکز بنا رہا۔ نئے طالب علم جن کی دسترس اس کمرے تک نہ ہو پاتی وہ دور سے حسرت سے اس کمرے کی رونقوں کو دیکھا کرتے تھے۔ جب تک اقبال اس کمرے میں مقیم رہے اس کمرے کی رونقیں آباد رہیں۔ علامہ محمد اقبال عام طور پر مشاعروں میں بہت کم جاتے۔ اسی کمرے میں اپنا شوق کو پورا کرلیا کرتے مگر اپنے ایک ہم جماعت کے اصرار پر لاہور کے ایک مشاعرہ میں شریک ہوئے جس میں اپنے دور کے معروف شاعر مرزا ارشد گورگانی بھی شریک تھے۔ اقبال نے جب اپنی غزل میں جب یہ شعر پڑھا

سوتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

ارشد گورگانی فرط جذبات میں اچھل پڑے اور انھوں نے اس شعر پر اقبال کی خوب تعریف کی، علامہ اقبال گاہے گاہے ان مشاعروں میں جانے لگے وہیں انھوں نے اپنی چند مزید غزلیں بھی سنائیں جن کا شہرہ لاہور کے علمی وادبی حلقوں میں خوب ہوا۔ انہی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ”جب اقبال سیال کوٹ سے لاہور آ کر گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے تھے تو اس زمانے میں اندرون بھاٹی دروازے کے بازار حکیماں میں انجمن اتحاد کے مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۵ء میں پہلی بار اس طرح کی ایک محفل مشاعرہ میں شرکت کی۔ اور پھر وہ بالالتزام ان مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور بصیرت میں اضافہ ہوا۔ اسی زمانے میں انجمن کشمیری مسلمانان کی سرگرمیوں میں بھی شامل رہے۔ مشاعرون کے ساتھ ساتھ وہ حکیم شہباز الدین

کی بیٹھک میں جمع ہونے والے لاہور کے نامور ادیبوں، عالموں اور شاعروں کی محفل میں بھی حاضری دینے لگے اور اپنی بعض نظمیں ان محفلوں میں پیش کر کے داد وصول کی۔ ان محفلوں سے اقبال کو کئی طرح کے فوائد حاصل ہوئے۔ ایک طرف مولانا عبدالحکیم کلانوری، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، مولانا اصغر علی روحی اور مولوی سراج الدین احمد جیسے فاضلین کی صحبت اور گفت گو نے اقبال کی ذہنی نشو ونما میں اہم کردار ادا کیا دوسری طرف اقبال کی شعری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انھیں انجمن حمایت اسلام میں شامل کر لیا گیا۔" ۱۵

انھی محفلوں میں شیخ عبدالقادر کے ساتھ دوستی کے سفر کا آغاز بھی ہوا۔ انھی محفلوں نے علامہ اقبال کے شعری ذوق کو جلا بخشی اور وہ خام سے کندن میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ ان محفلوں میں ہونے والی ادبی گفت گو بھی اقبال کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ ان محفلوں میں مولانا عبدالحکیم کلانوری، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، مولانا اصغر علی روحی اور مولوی سراج الدین احمد ایسے نابغہ روزگار ہستیوں سے بھی اکتساب فیض کا موقع میسر آیا۔ علامہ اقبال کی ادبی زندگی میں یہ محفلیں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔

ان ہی محفلوں میں منشی محمد دین فوق سے بھی ملاقات ہوئی، محمد دین فوق ان دنوں کشمیری قوم کی خدمت کے لیے سرگرم رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ محمد دین فوق نے انجمن کشمیری مسلمانان ہند کی پہلی مجلس میں محمد اقبال کو نظم پیش کرنے کی دعوت دی تو علامہ نے پچیس اشعار کی نظم وہاں پیش کی۔

اس حوالے سے عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

"منشی محمد دین فوق بھی داغ کے شاگرد تھے اور کشمیری قوم کی خدمت میں بھی سرگرم رہتے تھے اس لیے اقبال سے ان کو خصوصی اخلاص تھا چناں چہ ۱۸۹۶ء میں انجمن کشمیری مسلمانان ہند کی پہلی مجلس میں اقبال نے فوق صاحب کی تحریک پر پچیس اشعار کی ایک نظم پڑھی جس کا پہلا مصرع تھا:

''کیا تھا گردش ایام نے مجھے محزوں''

اور مقطع تھا:

جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں

اسے بھی باندھ لے اقبال صورت مضموں ......'' ۱۶

ان دنوں اقبال ترنم سے اپنی نظمیں پڑھتے اور سننے والوں پر رقت طاری ہو جاتی۔ سننے والوں کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور وہ رونے لگ جاتے تھے۔ "نالہ یتیم" بھی ان کی ایک ایسی ہی نظم ہے جو انھوں نے پہلی بار انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۸۹۹ء لاہور میں پڑھی۔ ایک تو نظم بہت ہی عمدہ اور متاثر کرنے والی تھی دوسرا سونے پہ سہاگہ یہ کہ حضرت علامہ محمد اقبال نے پرسوز ترنم کے ساتھ اس نظم کو پیش کیا۔ سننے والے اشک بار ہو گئے۔ اس نظم کا شہرہ پورے ہندوستان میں سنا گیا۔ علامہ محمد اقبال کو اس نظم نے بہت زیادہ شہرت عطا کی۔ برعظیم پاک و ہند کی کئی علمی و ادبی انجمنوں اور بزموں نے اقبال کو اپنے ہاں آنے اور دعوت کلام کی خواہشیں کیں مگر اقبال ایسی محفلوں میں شریک نہ ہوتے۔

انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں انھوں نے کئی تاریخی نظمیں پیش کیں اور خوب داد وصول کی۔ ایسی ہی نظموں میں خاص طور پر..........

''طلوع اسلام''

بانگ درا کی یہ آخری نظم انجمن حمایت اسلام کے اڑتیسویں سالانہ جلسہ منعقدہ مارچ ۱۹۲۳ء میں پڑھی گئی۔

''خضر راہ''

انجمن حمایت اسلام کے ۳۷ویں سالانہ جلسہ ۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء کو ترنم سے پڑھ کر سنائی۔

''شمع و شاعر''

۱۶ اپریل ۱۹۱۲ء کو انجمن حمایت اسلام کے ۲۷ویں سالانہ اجلاس میں پیش کی گئی۔

"شکوہ"

یہ نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے چھبیسویں سالانہ جلسے میں پڑھی گئی جو اپریل ۱۹۱۱ء میں ریواز ہاسٹل، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں منعقد ہوا۔

"جواب شکوہ"

شکوہ کے بعد علامہ اقبال نے جواب شکوہ لکھی اور یہ نظم ۱۹۱۳ء کے ایک جلسہ عام میں پڑھی گئی جو نماز مغرب کے بعد بیرون موچی گیٹ منعقد ہوا۔

علامہ محمد اقبال کی ان طویل نظموں کی کاپیاں بھی انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں فروخت ہوتیں جن کی رقم انجمن کے چندہ میں جمع کروادی جاتی۔ علامہ محمد اقبال کی طویل نظموں پر مبنی ایک کتاب بعنوان "اقبال کی طویل نظمیں" (فکری وفنی مطالعہ) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی لکھی ہوئی سنگ میل پبلی کیشنز نے شائع کی جس میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کی طویل دس نظموں کا فکری وفنی جائزہ لیا ہے اور نظموں کے پس منظر کے بارے میں بھی آگاہی فراہم کی ہے۔

علامہ محمد اقبال کی مالی سرپرستی ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کر رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اقبال کسی اچھے سرکاری عہدہ پر فائز ہو سکے۔ چناں چہ اقبال نے مقابلہ کا امتحان دینے کا ارادہ کیا لیکن میڈیکل معائنہ میں انھیں امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی تھی اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ ان کی دائیں آنکھ کی بینائی بہت کمزور تھی۔ اس ناانصافی پر "پیسہ اخبار" نے احتجاج بھی کیا۔ عبدالمجید سالک رقم طراز ہیں:

> "۱۹۰۱ء کا ذکر ہے کہ اقبال ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان مقابلہ میں شامل ہوئے لیکن میڈیکل بورڈ نے ان کو طبی نقطہ نگاہ سے "ان فٹ" قرار دیا۔ حالاں کہ بہ ظاہر ان کی صحت نہایت اچھی تھی۔ سرخ وسفید تھے اور اکھاڑے میں ڈنڑ پیلا اور مگدر ہلایا کرتے تھے۔ اس بے انصافی کے خلاف "پیسہ اخبار" "کشمیری گزٹ" نے احتجاجی نوٹ لکھے۔" ۱۷

علامہ محمد اقبال ایم اے فلسفہ پاس کرنے کے بعد ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربیک ریڈر تعینات ہو گئے۔ تنخواہ ۷۳ روپے ماہوار تھی کچھ عرصہ بعد یعنی ۴ جنوری ۱۹۰۱ کو گورنمنٹ کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ تعینات ہوئے۔ آپ یہاں ۱۹۰۵ء تک پڑھاتے رہے۔ اس دوران ۱۹۰۱ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں چھ ماہ کے لیے انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۲ء گورنمنٹ کالج لاہور کے لیے انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں علامہ محمد اقبال نے بھاٹی گیٹ لاہور کے اندر محلہ جلوٹیاں کے سامنے بازار میں بالا خانہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ مکان نمبر ۱۱ تھا۔ یہ مکان میاں احمد بخش کا تھا۔ ۱۹۰۳ء کو علامہ محمد اقبال کی پہلی کتاب ''علم الاقتصاد'' منظر عام پر آئی۔

علی بخش کی ملازمت :

علی بخش نے حضرت علامہ محمد اقبال کی خدمت میں زندگی کے شب و روز گزارے۔ اس خدمت کے صلے میں انہیں شہرت بھی نصیب ہوئی اور ان کے عزت و احترام میں بھی اضافہ ہوا۔ علی بخش ہی وہ شخص ہے جس نے علامہ محمد اقبال کی خدمت میں زیادہ عرصہ گزارا۔ وہ علامہ محمد اقبال کا ایسا ملازم تھا جس پر علامہ اقبال کو بھی فخر تھا اور علی بخش کو بھی یہ اعزاز تھا کہ وہ حضرت علامہ محمد اقبال کے قریب ہیں۔

جس زمانے میں علامہ اقبال کو گورنمنٹ کالج لاہور میں بہ طور پروفیسر پڑھانے کا موقع ملا انہی دنوں مولوی حاکم علی (جو بعد میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے) مشن کالج میں پڑھاتے تھے۔ علی بخش مولوی حاکم علی کے ہاں ملازم ہو گئے۔ مگر بعد ازاں علامہ محمد اقبال کے اصرار پر علی بخش مولوی حاکم علی کی ملازمت چھوڑ کر علامہ محمد اقبال کے ہاں ملازم ہو گئے اور پھر تادم مرگ انہی کے ہاں ملازم رہے۔

علی بخش کی وفاداری اور خدمت قابل مثال ہے۔ شکوہ نظم کی اشاعت کے بعد بہت سے احباب نے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا ساتھ چھوڑ دیا۔ علی بخش نے نامساعد حالات میں بھی ڈاکٹر علامہ اقبال کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اقبال کے معدوحین بھی علی بخش کا بہت احترام کرتے تھے۔ بیماری کے دنوں میں سب سے زیادہ

خدمت کی سعادت علی بخش کو ہی حاصل ہوئی۔

اس حوالے سے عبدالمجید سالک علی بخش کا ایک بیان قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب ولایت سے آئے تو میں نوکری چھوڑ کر ان کے پاس آ گیا۔ میری شادی ہو چکی تھی لیکن میری بیوی میرے لاہور آنے سے پہلے ہی فوت ہو گئی۔ گھر والوں نے دو تین دفعہ میری شادی کا انتظام کیا، میں شیخ صاحب (اقبال) سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔ میں نے جب بھی ان سے پوچھا، انھوں نے یہی جواب دیا کہ پہلے کھانے پینے کا انتظام کریں، پھر شادی کرنا مناسب ہوگا، غرض دوبارہ شادی کی نوبت ہی نہ آئی۔

یہ تھی علی بخش سے اس تعلق کی ابتداء جو تادم مرگ قائم رہا، بل کہ علی بخش حضرت علامہ کے انتقال کے بعد بھی ان کے بچوں کی خدمت میں منہمک رہا۔ آج کل کے زمانے میں ایسے ملازم بالکل ناپید ہیں، جو ایک آقا سے عمر بھر نباہ کریں اور ایسے آقا بھی کہاں ہیں؟" ۱۸

بھائی کا مقدمہ :

علامہ محمد اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد جو علامہ محمد اقبال کی کفالت بھی کر رہے تھے۔ اور ایس ڈی او کے عہدے پر فائز تھے اور کوئٹہ میں مقیم تھے۔ شیخ عطا محمد پر دو غیر مسلم ساتھیوں نے ایک انگریزی افسر کو کے ساتھ مل کر ایک جھوٹے مقدمہ میں پھنسانے کی سازش کی۔ پولیٹیکل ایجنسی بلوچستان کے ارباب اختیار شیخ عطا محمد کے پہلے ہی بہت خلاف تھے۔ علامہ کے بھائی شیخ عطا محمد کو ایک جھوٹے مقدمہ میں حراست میں لے لیا گیا۔ علامہ محمد اقبال کو اطلاع ملی تو وہ بہت پریشان ہوئے انھوں نے ذاتی طور پر بہت کوششیں کیں بالآخر علامہ محمد اقبال کی تگ و دو نے بھائی کو باعزت بری کروا دیا۔ اس حوالے سے عبدالمجید سالک لکھتے ہیں

"1903ء میں اقبال کو ایک شدید پریشانی سے سابقہ پڑا۔ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد اس زمانے میں بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس تھے۔ بعض مخالفین نے سازش کر کے ان کے خلاف ایک فوج داری مقدمہ کھڑا کر دیا جس میں عزت کے علاوہ جان کے بھی لالے پڑ گئے۔اقبال کو اس سلسلے میں فورٹ سنڈیمن جانا پڑا۔آخر بڑی جدوجہد اور لارڈ کرزن وائسرائے سے اقبال کی ذاتی اپیل کے بعد یہ قضیہ ختم ہوا۔خاندان بھر نے بے حد پریشانی اٹھائی، زرِ کثیر صرف ہوا لیکن شیخ عطا محمد باعزت بری ہوئے اور ملازمت پر بھی آنچ نہ آئی" ١٩

حضرت علامہ محمد اقبال نے جب وائسرائے ہند لارڈ کرزن کو خط لکھا جس میں انھوں نے سارے واقعات کی چھان بین اور صحیح پس منظر کے لیے تحقیقات کی درخواست کی تھی ساتھ ہی منظوم فریاد خواجہ نظام الدین اولیا کے سامنے پیش کی اور ساتھ ہی رب العزت کے حضور دعا بھی۔ جس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ بلوچستان ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کا تبادلہ ہو گیا اور سارا معاملہ بہتر ہو گیا ان کے بھائی کو باعزت طور پر رہائی مل گئی اور یوں ایک شدید پریشانی سے نکل آئے۔ پورا خاندان ایک اذیت اور کربناک صورت حال سے دوچار رہا۔

کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اس لیے یہ جھوٹا مقدمہ بھی ختم ہو گیا اور خاندان بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مرجھائے ہوئے چہروں پر گلاب مہکنے لگے۔ شیخ عطا محمد کی رہائی خاندان کی نیک نامی اور ساکھ کو بھی برقرار رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ علامہ محمد اقبال کی جدوجہد اور کوششیں رنگ لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس خاندان کو عزت و احترام بخش ہوئے شیخ عطا محمد کی رہائی ہوئی اور مقدمہ کرنے والوں کے منہ کالے ہوئے۔ وہ ذلت و رسوائی سے منہ چھپاتے رہے۔ شیخ عطا محمد علامہ اقبال سے عمر میں ۱۷ سال بڑے تھے۔ رڑکی کے تھامسن انجینئرنگ اسکول میں تربیت حاصل کی تھی۔ امتحان میں اول آئے اور اوورسیئر سے ترقی پا کر ایس ڈی او کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔

سفر یورپ :

کئی عوامل ایسے تھے جنھوں نے اقبال کو سفر یورپ پر اکسایا۔ پہلی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ مقابلہ کے امتحان میں میڈیکل بورڈ نے بائیں آنکھ کے پیدائشی نقص کو بہانہ بنا کر انہیں طبی نقطۂ نگاہ سے غیر موزوں قرار دے دیا تھا اس بے انصافی پر کئی طرح کے احتجاج بھی ہوئے "پیسہ اخبار" نے بھی احتجاج کیا۔ مگر ارباب اختیار نے کچھ نہ کیا اس واقعہ سے اقبال بہت دل برداشتہ ہوئے اور سفر یورپ کی ٹھان لی۔ دوسرا یہ بھی تھا کہ اقبال کو شروع سے ہی وکالت کی تعلیم حاصل کرنے کا شوق رہا تھا اسی شوق کی تکمیل کے لیے وہ عازم سفر ہوئے۔

یورپ جانے کی دلچسپی اس لیے بھی بڑھ گئی تھی کہ اقبال اپنے پسندیدہ استاد سر ٹامس آرنلڈ سے ملنے کی خواہش رکھتے تھے۔ وہ جہاں دوست احباب کو چھوڑ کر جانے کے دکھ میں مبتلا تھے وہاں آرنلڈ سے ملنے کی خوشی سے بھی سرشار تھے۔ علامہ محمد اقبال سر ٹامس آرنلڈ کی بہت عزت کرتے تھے ان کے لیے دل میں محبت رکھتے تھے۔ سر ٹامس آرنلڈ کے فراق میں علامہ محمد اقبال نے ایک نظم بھی کہی جو ان کے شعری مجموعہ "بانگ درا" میں شامل ہے۔ یہ اپنے استاد سے والہانہ محبت اور عقیدت کا لازوال اظہار تھا۔

اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا
ابر رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت
اند کے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

کھول دے گا دستِ وحشت عقدہ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو

تاب گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا

(بانگِ درا)

مولوی میر حسن نے علامہ اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد کو سمجھایا کہ اقبال کا یورپ جانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اس پر انھوں نے مالی اعانت کا وعدہ بھی کیا۔ علامہ محمد اقبال نے کچھ رقم جمع کر رکھی تھی کچھ رقم ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے فراہم کی اور یوں علامہ محمد اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ستمبر ۱۹۰۵ء کو یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ۲۴ ستمبر کو علامہ محمد اقبال لندن پہنچے تو ان کا استقبال شیخ عبدالقادر نے بڑے جوش و جذبے سے کیا۔ شیخ عبدالقادر، علامہ محمد اقبال کے دیرینہ دوستوں میں سے ہیں۔ یہ ان دنوں کے دوست تھے جب اقبال لاہور کی ادبی محافل میں شریک ہونا شروع ہوئے تھے۔ یہ وہی شیخ عبدالقادر ہیں، جنھوں نے علامہ محمد اقبال کے شعری مجموعہ "بانگِ درا" کا مقدمہ بھی لکھا۔ دو تین روز لندن رہنے کے بعد علامہ محمد اقبال کیمبرج چلے گئے جہاں انھوں نے ٹرنٹی کالج میں داخلہ لیا۔ یہ کالج اس حوالے سے بہت معروف ہے کہ یہاں سے فارغ التحصیل طلباء نے بہت نام کمایا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

"ٹرنٹی کالج، کیمبرج یونیورسٹی کا سب سے بڑا اور انگلستان کا ایک ممتاز کالج ہے
بعض نامور شخصیات مثلاً نیوٹن، بائرن، ٹینی سن، اور برٹرینڈ رسل نے اسی کالج

سے تعلیم حاصل کی تھی ۔ یہاں اقبال کو متعدد تجربہ کار، قابل اور اپنے اپنے موضوع پر بڑی مہارت اور تخصص رکھنے والے اساتذہ سے استفادے کا موقع ملا۔ انھیں خصوصی قواعد کے تحت بی اے آنرز کے امتحان کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنے کی اجازت دی گئی۔ موضوع تحقیق تھا The Development - of Metaphysics in Persia'' ۲۰

کیمبرج میں قیام کے دوران وہ تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے۔ تاہم علمی و ادبی مشاغل کے لیے بھی وقت نکال لیتے۔ گرمی کی چھٹیوں میں وہ لندن چلے جاتے جہاں انھوں نے لنکنز ان میں بار ایٹ لاء کے لیے داخلہ لے رکھا تھا۔ کیمبرج میں کالج سے باہر ان کا سب سے زیادہ وقت ڈاکٹر سید علی بلگرامی کے ساتھ گزرتا ان محافل میں شیخ عبدالقادر اور عطیہ فیضی بھی شریک ہوتے رہتے۔ ٹرنٹی کالج کیمبرج میں پروفیسر آرنلڈ، میک ٹیگرٹ، پروفیسر براؤن، اور پروفیسر نکلسن سے ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ پونے دو برس کی محنت کے بعد علامہ اقبال مئی ۱۹۰۷ء میں بی اے آنرز کی ڈگری سے سرفراز ہوئے۔ ان کے پروفیسر ٹامس آرنلڈ نے میونخ یونیورسٹی (جرمنی) میں پی ایچ ڈی کے لیے ان کی رجسٹریشن کرائی تھی۔

علامہ محمد اقبال جولائی ۱۹۰۷ء کو لندن سے میونخ (جرمنی) پہنچے وہاں انھوں نے لاطینی زبان کے بجائے انگریزی زبان میں مقالہ لکھنے کی درخواست دی جو منظور ہو گئی۔ تاہم علامہ محمد اقبال پر ایک شرط یہ عائد کر دی گئی کہ ان کا زبانی امتحان جرمنی میں ہوگا۔ اس کے لیے انہیں جرمنی سیکھنا بہت ضروری ہے۔ لہذا علامہ محمد اقبال نے مس ایما ویگے ناسٹ سے جرمن زبان سیکھی۔ ۴ نومبر ۱۹۰۷ء کو میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دوبارہ لندن واپس آئے اور نومبر ۱۹۰۵ء میں لنکنز ان میں بار ایٹ لاء کے لیے داخلہ لیا اور جولائی ۱۹۰۸ء میں کورس مکمل کیا۔ اس کے علاوہ اقبال نے معاشیات اور سیاسیات کے مطالعہ کے لیے لندن سکول آف اکنامکس اور پولیٹیکل سائنس میں داخلہ لیا اور کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ اخلاق کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی۔

اقبال مس ایما ویگے ناسٹ کے حسن سلوک اور حسن اخلاق سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے "بانگ درا" میں شامل بعض نظموں میں اس چیز کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

جولائی ۱۹۰۷ء میں وہ لندن سے میونخ پہنچے انھیں جرمنی یا لاطینی کے بجائے انگریزی زبان میں مقالہ پیش کرنے کی اجازت مل گئی (چند ایک ترامیم کے بعد یہ وہی کیمبرج والا مقالہ تھا)، البتہ یہ شرط عائد کی گئی کہ انہیں تین ماہ تک جرمنی میں مقیم رہ کر جرمن زبان سیکھنا ہوگی، کیوں کہ زبانی امتحان جرمن میں ہوگا، چناں چہ انھوں نے مقالہ جمع کرا دیا اور ضروری دفتری کارروائی کے بعد، زبان سیکھنے کے لیے میونخ سے ہائیڈل برگ چلے گئے۔ یہاں وہ ایک پرائیویٹ ہاسٹل "شیرز منزل" میں داخل ہو گئے۔ یہ دریائے نیکر کے کنارے واقع تھا۔ مس ایما ویگے ناسٹ (۱۸۷۹۔۱۹۶۴ء) اقبال کی استانی مقرر ہوئیں۔ اقبال نے ان سے جرمن زبان سیکھی۔ وہ ان کے حسن اخلاق اور حسن صورت سے بھی متاثر ہوئے۔ بانگ درا میں شامل اس زمانے کی بعض نظموں سے اقبال کے جذبات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔" [۲۱]

علامہ محمد اقبال کے سفر یورپ کے بارے میں اقبال کی طالبانہ زندگی کے بارے میں بڑی مفید معلومات عطیہ فیضی کے مجموعہ خطوط اقبال سے ملتی ہیں۔ چوں کہ یہ ماخذ صحیح، معاصرانہ اور مستند ہیں اس لیے ان کی قدر و قیمت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مس بیک لندن میں ہندوستانی طلبا کا ہر طرح سے تعاون رکھتیں ان کی امداد، دیکھ بھال اور خدمت میں مصروف کار رہتیں۔ وہ کئی بار اقبال کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کرتی رہیں جس میں عطیہ فیضی اور دیگر شریک ہوتے رہے۔ ان محفلوں میں اقبال سے تبادلہ خیالات کا موقع بھی ملتا رہا۔ مختلف شعراء کے بارے میں بتاتے رہتے۔ ان کے اشعار سناتے۔

عطیہ فیضی کو اقبال کو بہت قریب سے جاننے کا موقع میسر آیا۔ کئی تقریبات میں شریک ہوتے رہے۔ علامہ محمد اقبال نے سیکڑوں خطوط عطیہ فیضی کے نام لکھے۔ جو بعد میں عطیہ فیضی نے کتابی صورت میں بھی شائع کروائے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اقبال بعض معاملات میں بھی عطیہ فیضی سے گفت گو کرتے رہے ہیں۔ اقبال اپنی ذہنی کیفیات کے بارے میں بھی لکھتے رہے ہیں۔ ایک کھانے میں شریک ہوئے تو اس تقریب میں جرمن سکالروں میں سیلوسٹر، مس لیوی، موسیو مارل اور ہیر میز نراتھ (مشہور موسیقار) بھی شریک تھے۔ اقبال ایسی تقریبات میں فی البدیہہ اشعار بھی سناتے رہتے کوئی نوٹ کرنے لگتا تو فرماتے یہ شعر وقتی ہوتے ہیں ان کو لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

عبدالمجید سالک ایک تقریب میں لکھتے ہیں:

> ''۲۲ اپریل کو عطیہ بیگم، اقبال اور شیخ عبدالقادر لندن سے کیمبرج کو روانہ ہوئے او رسید اور بیگم سید علی بلگرامی کے ہاں پہنچے جہاں اقبال نے عطیہ بیگم کا تعارف کرایا۔ اس موقع پر بھی نہایت بلند پایہ علمی مذاکرات ہوئے۔ عطیہ فیضی کہتی ہیں کہ کبھی کبھی اقبال ماندہ و افسردہ معلوم ہوتے تھے اور بادی النظر میں محسوس ہوتا کہ اب یہ ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالیں گے لیکن جہاں کسی ہم صحبت شخص کی زبان سے کوئی قابل جواب فقرہ نکلا، اقبال کا فقرہ بجلی کی طرح کوند گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اقبال کی طبیعت کا خاصہ ہے۔'' ۲۲

ایسی تقریبات میں اقبال کوئی نہ کوئی ایسا جملہ یا ایسا فقرہ ضرور کہہ جاتے جو مدتوں یاد رکھنے والا ہوتا۔ یکم جون ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ نے دریا کے کنارے ایک پکنک کا اہتمام کیا جس میں اقبال بھی موجود تھے۔ پروفیسر آرنلڈ گفت گو کرتے کرتے موت و حیات کے فلسفہ پر پہنچ گئے یہاں پہنچ کر مسئلہ بہت پیچیدہ شکل اختیار کرنے لگا تو پروفیسر آرنلڈ نے کہا اقبال آپ بھی اس پر کچھ روشنی ڈالیے تو اقبال جو کافی دیر خاموش بیٹھے ساری گفت گو سن رہے تھے اچانک بولے۔ ''زندگی موت کی ابتدا ہے اور

موت زندگی کا آغاز ہے" اقبال کا یہ جملہ سن کر اس تقریب کا اختتام ہوا۔

پروفیسر آرنلڈ حضرت علامہ محمد اقبال کی قابلیت اور گوناگوں صلاحیتوں کے معترف تھے یہی وجہ ہے کہ وہ بعض معاملات میں سمجھتے تھے کہ اقبال مجھ سے زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ ۹ جون کو پروفیسر آرنلڈ کے ہاں ایک ڈنر میں اقبال بھی مدعو تھے۔ پروفیسر آرنلڈ نے بتایا کہ جرمنی میں نہایت نادر عربی مخطوطہ برآمد ہوا ہے۔ جس کی تصحیح اور جس کے اقتباس کے لیے میں اقبال کو بھیجنا چاہتا ہوں کیوں کہ میری نظر میں اس ذمہ دارانہ کام کے لیے صرف اقبال ہی موزوں ترین ہیں۔

۲۲ جون کو عطیہ بیگم کے مکان پر چند انگریزی اور ہندوستانی مہمان جمع ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری نے گانا سنایا، لارڈ سنہا کی لڑکیوں کوملا اور رو ملا نے بھی موسیقی پر اپنا کمال دکھایا اس محفل میں اقبال نے فی البدیہہ اشعار سنائے۔ جس میں طنز و مزاح کا عنصر بھی شامل تھا۔

۲۹ جون کی ایک تقریب میں عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

"۲۹ جون کو ایک معزز خاتون لیڈی ایلیٹ نے ایک پارٹی دی جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔ دفعتاً مس سروجنی داس نہایت پر تکلف لباس اور جھلملاتے ہوئے زیورات پہنے جھم جھم کرتی سامنے آن موجود ہوئیں۔ لوگ ان کے ذوق پست کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ انھوں نے دفعتاً اقبال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا" میں تو صرف آپ سے ملنے کے لیے یہاں آگئی ہوں" اقبال کی طبیعت کا شعلہ چکا اس نے کہا: "تو یہ صدمہ اس قدر رنا گہانی ہے کہ میں نہیں سمجھتا اس کمرے سے زندہ سلامت باہر جا سکوں گا"۔ ۲۳

عطیہ فیضی نے علامہ محمد اقبال کے فکر و فن کو نہ صرف سمجھا بل کہ اقبال کے ذہنی ارتقاء کو بھی بخوبی سمجھا ہے۔ اقبال کے خطوط جو انھوں نے عطیہ فیضی کے نام لکھے وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لندن میں لاتعداد تقریبات میں علامہ اقبال کے ساتھ شریف ہوئیں اور مختلف بحثوں میں بھی شریک

ہوئیں۔عطیہ فیضی کے حوالے سے ایسی ہی ایک تقریب کا حال عبدالمجید سالک بیان کرتے ہیں:

"۲۳ جولائی کو لندن میں بعض ہندوستانی جمع ہوئے تو ایک طالب علم پرمیشر لال نے ذکر کیا کہ میرے پاس وطن سے جو خطوط آئے ہیں اور ایک اردو کا رسالہ "مخزن" موصول ہوا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے جو قوم پرستانہ نظمیں اور گیت لکھے ہیں، ان سے شمالی ہند کے کوچہ و بازار اور مدرسے اور گھر گونج رہے ہیں اور ان سے قوم پرستی کا ایک ایسا جذبہ بیدار ہو گیا ہے جس کی مثال ہندوستان میں اس سے پیش تر موجود نہ تھی۔اس کے بعد اس طالب علم نے وہ نظمیں گا کر سنائیں۔سب ہندوستانی اس سے آواز ملا کر گانے لگے اور ہال گونج اٹھا۔" ۲۳

پروفیسر آرنلڈ بھی اقبال کے خطوط کو جمع کرتے رہے انھوں نے مختلف اہل دانش کے نام لکھے ہوئے کئی خطوط ان سے لے کر اپنے پاس بطور ریکارڈ اور حوالہ کے جمع کیے۔عطیہ فیضی کے نام بھی کئی قیمتی خطوط ان کے پاس ہیں۔بعض کتب میں یہاں تک لکھا ہے کہ پروفیسر آرنلڈ نے تقریباً خطوط کے دو مسودات عطیہ فیضی سے لے کر محفوظ کیے۔

جرمنی میں حضرت علامہ محمد اقبال زیادہ تر ہائیڈل برگ میں رہتے یہاں انھیں اپنے مقالے کے حوالے سے تحقیق تدوین میں کافی سہولیات میسر تھیں۔اقبال کو یہاں رہ کر جرمن پروفیسرز سے بہت کچھ سیکھنے کا بھی موقع ملا۔ہر طالب علم یونی ورسٹی کی نصابی سرگرمیوں کے علاوہ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتا جیسا کہ کشتی رانی، موسیقی، باغبانی اور کوہ پیمائی۔طالب علم دن بھر کی رسمی تعلیم کے علاوہ دریائے کے کنارے کافی ہاؤسز میں اپنے پروفیسرز کے پاس جا بیٹھتے اور ان سے مختلف موضوعات پر مباحث کرتے۔اقبال بھی ایسے کئی مباحث میں شریک ہوتے اور بڑھ چڑھ کر ان میں حصہ لیتے۔اقبال اپنی پروفیسرز سے بے حد متاثر تھے۔اس حوالے سے عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

"دن بھر کی رسمی تعلیم کے خاتمے پر طلبہ اور پروفیسر پاس ہی ایک دریا کے کنارے کافی ہاؤس میں جا بیٹھتے اور وہاں دونوں خاتون پروفیسرز جرمن، یونانی اور فرانسیسی فلسفے پر طلبہ سے مذاکرہ شروع کر دیتیں۔ اقبال ان کے علم و فضل سے بے حد متاثر ہوتے اور ایک ایک لفظ بغور سنتے، خصوصاً وہ فراؤ سینے شال کی معلومات علمی سے بہت مرعوب تھے اور جب کبھی وہ اقبال کے کسی غلط جواب پر انہیں ٹوکتیں تو اقبال سکول کے ایک بچے کی طرح پشیمان ہوتے۔ اس بے تکلف علمی مجلس کے بعد یہ سب لوگ کافی ہاؤس سے نکل کر پاس ہی ایک پہاڑی پر چڑھ جاتے جس پر پہنچنے کے لیے ایک ہزار سیڑھیاں طے کرنا پڑتی تھیں، اور سب لوگ تکان سے بچنے کے لیے گاتے ہوئے چڑھتے لیکن یہ گانا اکثر نہایت بے سرا ہوتا تھا۔ اقبال کہا کرتے تھے کہ وادی نیکر کا بہتر منظر اسی پہاڑی سے دیکھا جا سکتا ہے۔" ۲۵

حضرت علامہ محمد اقبال نے قیام یورپ میں تین سال گزارے ان کے بہت مثبت اثرات اقبال کی زندگی پر مرتب ہوئے۔ انھوں نے اس قیام سے وسیع تجربات و مشاہدات حاصل کیے۔ ان تین سالوں میں اقبال کی فکر اور سوچ کو بالیدگی عطا ہوئی انھیں دلائل کے ساتھ بات کرنے کا ہنر سکھایا۔ ان کے مزاج میں تبدیلی رونما ہوئی۔ اقبال نے ان تین سالوں میں تین اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کر کے سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اقبال نے کیمبرج سے بی اے، میونخ سے پی ایچ ڈی اور لنکنز ان سے بیرسٹر ایٹ لاء کے امتحانات پاس کیے۔

علامہ محمد اقبال نے یورپ کو نہایت قریب سے دیکھا، انھوں نے یورپ کا ایک نیا چہرہ بھی دیکھ لیا وہ یورپ کی کھوکھلی تہذیب کی ناپائیداری کی باتیں کرنے لگے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ چکا چوند عارضی ہے جلد ختم ہو جانے والی ہے۔ وہ مغربی تعلیم و تہذیب کے بھی خلاف ہو گئے تھے۔ وہ جتنا اس

تہذیب وتمدن کے نزدیک ہوتے گئے اتنا ہی اس سے دور بھاگنے لگے تھے۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اقبال نے یورپی تہذیب اور معاشرت کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور قریب سے اس کا مشاہدہ کیا تو وہ سمجھ گئے کہ اس تمدن کی ظاہری چکا چوند، ایک فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کے نتیجے میں اسلام کی حقانیت ان پر واضح اور پختہ تر ہوتی چلی گئی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بقول: "مغربی تعلیم وتہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا، اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا" اقبال نے خود ایک جگہ اعتراف کیا ہے کہ "یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا"[۲۶]

علامہ نے مغربی تہذیب اور سیاست کے خلاف ایک مسلسل اور ہمہ جہت سعی کا آغاز کر دیا جس کا ایک رخ اس تہذیب وتمدن کے اندرونی تضادات اور معائب کو بے نقاب کرنا تھا۔ وہ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ مغربی تہذیب وسیاست کی چکاچوند عارضی ہے جلد ختم ہو جائے گی۔ انھوں نے مسلمانوں کو اپنی تہذیب پر فخر کرنے کا درس دیا:

دیارِ مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

مغربی تہذیب وتمدن کی کوتاہیاں، سرمایہ داری نظام کی خرابیاں اقبال پر عیاں ہو چکی تھیں۔

اقبال نے یورپ میں رہ کر قریب سے اس نظام اور تہذیب کا مشاہدہ کیا تھا اگرچہ مشاہدہ تو سرسید احمد خان نے بھی انگلستان میں رہ کر کیا تھا لیکن وہ اس تہذیب کو تنقید کی نظر سے نہیں تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اقبال چوں کہ دروں بیں تھے اس لیے وہ آنے والے خطرات کو بھانپ چکے تھے اسی لیے انھوں نے اس تہذیب ناپائیدار کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ انھوں نے دیار مغرب کے رہنے والوں کو مخاطب کر کے یہ اشعار کہے تھے۔ علامہ محمد اقبال یہ بات بخوبی سمجھ گئے تھے کہ مغربی تہذیب سے فرار اور اپنی ملت پر قیاس کرنے سے ہی امت مسلمہ پر امن اور خوشحال زندگی گزار سکتی ہے۔

علامہ محمد اقبال نے طوفان مغرب میں اسلامی فکر و فلسفہ کے گوہر ہائے نایاب کی تبلیغ کی۔ مغرب اور وہاں کے مفکرین کے افکار کے مطالعہ کے بعد انھوں نے مسلمانوں کو اپنی ملت پر قیاس کا پیغام دیا۔ یہ تو اٹل حقیقت ہے کہ اقبال اور اسلامی افکار کو کسی طور بھی جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے مغربی علوم کے فکری دھاروں کا مطالعہ کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ بیکن، لاک، کانٹ، نطشے، شوپن ہار، کارل مارکس، برگساں، دانتے، ملٹن، گوئٹے، اور ایسے کئی مغربی مفکرین کے مطالعہ نے انھیں تجزیاتی مواد فراہم کیا۔ اقبال نے ان کے نظریات کو پڑھا اور من و عن تسلیم نہیں کیا بل کہ جہاں اختلاف رائے کی گنجائش بنی وہ بھی کیا ہے۔ علامہ محمد اقبال ایسے نابغہ روزگار تھے کہ وہ ہر بات اور ہر نظریہ کو بغور دیکھتے، اسے پرکھنے کے بعد اس پر عمل پیرا ہوتے۔ جہاں انھیں محسوس ہوتا کہ یہ نظریہ اسلام سے متصادم ہے تو وہ نظریہ ماننے سے انکار کر دیتے تھے بل کہ اس کے خلاف لکھتے رہے۔ اقبال کی سمجھ میں یہ نقطہ آ گیا تھا کہ کوئی بھی قوم تہذیب یا معاشرہ اسی وقت مستحکم رہتا ہے جب وہ اپنی تاریخ سے جڑا رہتا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ اسلام سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ اس تاریخ سے الگ ہو کر کبھی مستحکم نہیں رہ سکتے اقبال کا خیال تھا کہ قومی زندگی کے شعور کی ترویج اور فرد کی خودی کی تکمیل کے لیے تاریخ کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ثقافت کی روح اور تہذیب کے مظاہر دریافت کرنے کے لیے مسلم مفکرین اور دانشوروں کی کاوشوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں۔

"یورپ میں اقبال کو بالکل ایک نئے، مختلف اور آزادانہ ماحول سے سابقہ پیش آیا تھا۔ایک مخلوط معاشرے میں جہاں بے حجابی، عریانی کی حدود کو چھو رہی تھی، اقبال کو قلب ونظر کی آزمائش کا سامنا تھا۔خاص طور پر انگلستان میں عطیہ بیگم، اقبال کی جذباتی زندگی کے لیے ایک آزمائش بنی اور جرمنی میں اقبال کو اپنی جرمن ٹیوٹر ایما وگیے ناست سے سابقہ پیش آیا۔اقبال کی نظر میں عطیہ کے مقابلے میں ایما کی شخصیت کہیں زیادہ برتر اور فائق تھی۔وہ ایما کے حوالے سے دل ودماغ کی کش کش کا شکار رہے۔(لیکن بالآخر وہ ان آزمائشوں سے سرخ رو ہو کر نکلے)" ۲۷

حالتِ استغراق:

جرمنی کے قیام کے دوران علامہ محمد اقبال اکثر عجیب وغریب عالم استغراق کی کیفیت میں چلے جاتے۔اس دوران وہ دنیا ومافیہا سے کٹ جاتے اور انہیں کوئی ہوش نہ رہتا وہ عجب حالت میں مبہوت ہو جاتے۔اس حوالے سے عبدالمجید سالک ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

"۲۲ اگست کو ایک عجیب واقعہ ہوا:طلبہ اور پروفیسروں نے ایک پکنک کا انتظام کیا اور ہر شخص کو اس کے مسکن سے ساتھ لیتے گئے۔اقبال کا مسکن اس راستے پر ایک عالم مدہوشی میں خاموش اور بے حرکت بیٹھے تھے۔معلوم ہوا کہ وہ شب گزشتہ ہی سے اس عالم میں ہیں، سامنے ایک کتاب رکھی ہے۔اور بالکل پتھر کے بت کی طرح اپنے ماحول سے قطعاً بے خبر بیٹھے خلا میں گھور رہے ہیں۔طلبا یہ دیکھ کر بے حد حیران ہوئے اور دونوں خاتون پروفیسروں کی تشویش تو لا انتہا تھی۔طرح طرح کے اندیشوں کی وجہ سے کوئی اقبال کے پاس نہ پھٹکتا تھا، آخر عطیہ بیگم نے جرأت

کی اور اقبال کو کندھوں سے پکڑ کر کہا کہ آپ ہندوستان میں نہیں بل کہ جرمنی میں ہیں" ۲۸

ایسے ہی کئی واقعات سامنے آئے جس میں اقبال عالم استغراق میں چلے جاتے اس وقت انھیں اپنے آس پاس کی کوئی خبر نہ رہتی وہ کسی ایسی دنیا میں چلے جاتے جس کا کسی کو کوئی ادراک نہ ہوتا۔ اس حالت میں کافی دیر رہتے پھر انہیں جھنجھوڑنے یا پھر بلانے پر اس حالت سے باہر آتے۔

یورپ سے واپسی :

حضرت علامہ محمد اقبال اپنے سینے پر تین اعلیٰ ترین ڈگریاں سجائے یورپ سے وطن کے لیے واپس ہوئے تو سب سے پہلے بمبئی، دہلی اور انبالہ میں کچھ دوست احباب سے ملتے ہوئے ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو دوپہر کی ٹرین سے لاہور پہنچے۔ بعض محققین کا یہ بھی کہنا ہے کہ انھوں نے دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاء، امیر خسرو اور مرزا غالب کے مزار پر دوبارہ حاضری دی اور اتوار ۲۷ جولائی کو لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر صابر کلوروی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "یورپ سے واپسی کے بعد اقبال پہلے بمبئی میں اپنے دوستوں سے ملے۔ اس کے بعد انھوں نے دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاء، امیر خسرو اور مرزا غالب کے مزار پر دوبارہ حاضری دی اور انبالہ میں احباب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء بروز دوشنبہ دوپہر کی ریل گاڑی سے لاہور پہنچے۔ دوست اپنی معیت میں بھاٹی دروازے لے گئے۔ جہاں باغ میں شامیانے نصب کر کے چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر آپ اسی دن سیال کوٹ میں اپنے والدین سے ملنے چلے گئے۔" ۲۹

علامہ محمد اقبال آزاد منش طبیعت کے مالک تھے۔ نوکری یا ملازمت ان کے مزاج کے خلاف تھی

یہی وجہ تھی کہ کئی ملازمتوں کو چھوڑ چکے تھے یا پھر مسترد کر دی گئیں تھیں۔ وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے تا کہ وہ آزاد بھی رہیں اور اظہار رائے میں بھی آزاد رہیں۔ انگریز کی ملازمت کرنا گویا اظہار رائے کی پابندی کے مترادف سمجھتے تھے۔ علی بخش کے استفسار پر اقبال نے جو جواب دیا اسے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

''ایک بار علی بخش نے پوچھا:

''آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی''؟

کہنے لگے: ''علی بخش! انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکلیں ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے دل میں کچھ باتیں ہیں، جنھیں میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں، مگر انگریز کا نوکر رہ کر انھیں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا۔ اب میں بالکل آزاد ہوں، جو چاہوں، کہوں اور جو چاہوں، نہ کہوں'' ۳۴

سفر یورپ کے بعد ڈاکٹر علامہ محمد اقبال سیال کوٹ میں ہی تھے کہ ان کے بھائی شیخ عطا محمد لاہور آئے اور ان کے لیے ضلع کچہری میں دفتر کے حصول کو ممکن بنایا اور ضلع کچہری کے قریب ہی اردو بازار میں کرائے کا مکان تلاش کرنے لگے۔ شیخ عطا محمد نے اردو بازار میں علامہ کے لیے ایک مکان کرائے پر لیا لیکن کچھ عرصہ اقبال یہاں رہے پھر انارکلی کا بالا خانہ کرائے پر لے لیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اس حوالے سے عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

''تین چار دن کے بعد علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سیال کوٹ سے آ کر مرزا جلال الدین بیرسٹر سے ملے اور علامہ کے لیے دفتر کرائے پر لینے کا کام ان کے سپرد کیا، چناں چہ موہن لال روڈ پر گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام کے پاس علامہ کے لیے ایک مکان کرائے پر لے لیا گیا۔ (موہن لال روڈ کو آج کل اردو بازار کہتے ہیں۔ یہ مکان مطبع مفید عام کے بالکل سامنے واقع ہے اور آج کل اس میں

سٹیشنری کی دکان ہے) قانونی کتابوں کی لائبریری کا انتظام بھی کیا گیا اور منشی طاہر الدین مرحوم علامہ کے منشی مقرر کیے گئے۔" [۱۳]

دوست احباب کا اصرار تھا کہ علامہ محمد اقبال ضلع کچہری میں وکالت کریں اسی بنا پر اقبال نے کچہری کے قریب دفتر بنایا لیکن انھوں نے چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے کو ترجیح دی ۔اس لیے اقبال نے اردو بازار والا مکان چھوڑ دیا اور انارکلی بازار کا وہ بالا خانہ کرائے پر حاصل کر لیا جس میں ان سے پیشتر سر محمد شفیع بھی کافی عرصہ یہاں قیام پذیر رہے تھے۔اسی مکان کو بطور دفتر بھی بنائے رکھا۔ بعد ازاں مکان کو منہدم کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ نیو مارکیٹ کی عالیشان عمارت کھڑی ہے۔چاہیے تو یہ تھا کہ اس مکان اور دفتر کو اقبال کے نام سے منسوب کر کے اسے قومی تحویل میں رکھا جاتا اور اقبال کی یادگار کے طور پر اس کی حفاظت کی جاتی مگر حکومت نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی جس کے باعث اس یادگار کو منہدم کر دیا گیا اور اس جگہ پر اب پُرشکوہ عمارت نظر آتی ہے۔جو ہم سب کے لیے ایک لمحہ فکریہ بھی ہے۔

اقبال کے قریبی دوستوں کا خیال ہے کہ سفر یورپ کے بعد اقبال کی عادات و خصائل میں کوئی واضح تبدیلی نہیں ہوئی لیکن ان کے نظریات کافی حد تک بدل چکے تھے۔غلام بھیک نیرنگ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: "میں دن کے وقت لاہور پہنچا اور سیدھا ان کے ہاں گیا۔ملازموں نے میری پذیرائی کی مگر معلوم ہوا کہ اقبال کہیں گھومنے گئے ہیں۔میں نے کہا خدا کا شکر ہے کہ اقبال نے بھی گھر سے نکلنا سیکھا۔تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے تو میں نے دیکھا کہ نہایت منتعلیق سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔میں نے دوسرا شکر ادا کیا کہ اقبال نے لباس پہننا بھی سیکھا۔اس سے پہلے وہ لباس کے بارے میں صرف سادہ ہی نہیں لاپروا بھی تھے .... اس کے بعد وہ سوٹ اتر گیا۔وہی ہمیشہ کا تہبند بندھ گیا۔وہی بنیان بدن پر رہ گیا وہی کمبل شانوں پر سوار ہو گیا۔"

علامہ محمد اقبال نے کئی اعلیٰ ملازمتیں ٹھکرا دی تھیں جن میں علی گڑھ یونیورسٹی میں بطور پروفیسر، گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ کے پروفیسر کی ملازمتیں بھی شامل تھیں۔وہ زیادہ سے زیادہ وقت وکالت

میں صرف کرنا چاہتے تھے اور اسی پیشہ میں اپنا نام بنانے کی تگ ودو میں لگے رہتے تھے۔ ان کی اولین خواہش تھی کہ اسی پیشہ میں نام بنایا جائے۔ ملازمت کے سخت خلاف تھے۔ لاہور میں دوبارہ آجانے کے وقت گورنمنٹ کالج کے فلسفہ کے پروفیسر برٹ کے جانشین مسٹر جیمز کے اچانک انتقال کے بعد جگہ خالی ہوئی تو پرنسپل مسٹر رابسن نے اقبال پر زور دیا کہ وہ اس جگہ پر تعینات ہوں مگر اقبال نے اپنی وکالت کی مصروفیات کے باعث انکار کر دیا۔ پرنسپل رابسن نے عدالت عالیہ سے باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کر لیا جس کے مطابق اقبال کا دن گیارہ بجے سے پہلے کوئی مقدمہ پیش نہیں ہوا کرے گا۔ اس اجازت نامہ کے بعد اقبال بادل نخواستہ ڈیڑھ سال کے لیے ایم اے کی کلاسوں کو فلسفہ اور بی اے کو انگریزی پڑھاتے رہے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۰ء کو گورنمنٹ کالج کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔

ازدواجی زندگی:

یورپ سے واپسی کے بعد پانچ چھ سال تک اقبال ذہنی طور پر بہت اضطراب میں رہے اور اندرونی شکست وریخت سے نبرد آزما ہوتے رہے۔ کیوں کہ ان کی پہلی بیوی کی طبیعت اور مزاج ان کے خلاف تھا سو یہ شادی اپنے اختتام کو پہنچی تو دوست احباب کے اور والدین کے بھرپور اصرار پر اقبال نے لاہور میں ہی مقیم ایک کشمیری خاتون سردار بیگم (والدہ جاوید اقبال) سے ۱۹۱۰ء میں نکاح کر لیا۔ (رخصتی تقریباً تین سال بعد ہوئی)۔ ایک گم نام خط نے اقبال اور سردار بیگم کے درمیان غلط فہمیوں کو جنم دیا اور یوں ۱۹۱۳ء میں لدھیانہ کی مختار بیگم سے عقد ثالث ہوا۔

جب اقبال کو اس سازش کا پتہ چلا تو سردار بیگم سے تجدید نکاح کے بعد اسے گھر میں لا بسایا۔ دونوں بیگمات یعنی مختار بیگم اور سردار بیگم انارکلی والے مکان میں ایک ساتھ رہتی رہیں۔ دونوں بیگمات میں بہت محبت اور انس کا ایسا رشتہ قائم رہا جسے لوگ رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مختار بیگم ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو زچگی کے دوران رحلت فرما گئیں۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو علامہ کی صاحبزادی معراج بیگم کا 18 برس

کی عمر میں انتقال ہوا۔

سردار بیگم اور مختار بیگم کے باہمی سلوک کے بارے میں جاوید اقبال کے بیان کو ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے لکھا ہے:

> "بقول جاوید اقبال: "دونوں میں ایسی محبت پیدا ہو گئی جو بہنوں میں بھی نہیں ہوتی۔ازدواجی زندگی کا بحران ختم ہوا۔زندگی پرسکون ہو گئی لیکن مختار بیگم ۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو زچگی میں انتقال کر گئیں" ۳۲

بحیثیت وکیل:

حضرت علامہ محمد اقبال وکالت کے پیشے کو بڑا معتبر اور آزادانہ سمجھتے تھے وہ کسی کی ملازمت کے حق میں نہ تھے۔انھوں نے کئی اہم ترین ملازمتیں محض اس لیے ٹھکرا دی تھیں کہ وہ آزاد منش آدمی ہیں کسی کی ملازمت کرنے سے ان کے اظہار رائے پر قدغن لگ جائے گی۔وہ وکالت کے پیشے کو ہی اپنا کر اس میں نام پیدا کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔وہ ہر مہینے کی دس تاریخ کے بعد کوئی کیس نہ پکڑتے،کوئی مؤکل آبھی جاتا تو اسے سمجھاتے کہ آپ کسی اور وکیل کا بندوبست کرلیں میں اگلے ماہ کی پہلی تاریخوں میں آپ کا کیس لے سکوں گا۔دراصل علامہ اتنے کیس پکڑتے جس سے آسانی سے گھر کے اخراجات پورے ہوسکیں زیادہ کیس نہ پکڑتے۔بل کہ کوئی زیادہ اصرار کرتا تو اسے کسی اچھے وکیل کے پاس جانے کا کہہ دیتے۔

جھوٹے اور کمزور کیس کبھی نہ پکڑتے۔بل کہ اسے سمجھاتے کہ آپ کا کیس انتہائی کمزور ہے آپ یہ کیس ہار جائیں گے اس لیے اس سے باز رہیں۔ایک دفعہ ایک شخص آپ کے سامنے ایک کیس لایا جس کے بارے میں علامہ کا خیال تھا کہ بالکل بے جان ہے۔چناں چہ انھوں نے اس مقدمے کی پیروی کرنے سے معذرت کا اظہار کیا لیکن مؤکل اپنی ضد پر اڑا رہا اور کہنے لگا کہ آپ جتنے پیسے چاہیں

لے لیں مگر میرا مقدمہ ضرور لڑیں چاہے میں ہار جاؤں مجھے کوئی دکھ نہ ہوگا۔ علامہ محمد اقبال کی جگہ کوئی اور وکیل ہوتا تو فوراً اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منہ مانگی رقم طلب کرسکتا تھا مگر اقبال نے ایسا نہ کیا۔

علامہ محمد اقبال نے کبھی روپے پیسے کا لالچ نہ کیا تھا جو مل جاتا اسی پر صبر و قناعت کر لیتے تھے۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۴ء تک وکالت کے پیشہ سے منسلک رہے۔ وہ اپنے اخراجات کے علاوہ ہر ماہ کچھ پیسے والدین کو بھی بھجواتے رہتے۔ اس حوالے ڈاکٹر صابر کلوروی لکھتے ہیں:

"بحیثیت وکیل انھوں نے ۱۹۰۸ء، سے لے کر ۱۹۳۴ء تک کام کیا۔ اقبال کی دوسری دلچسپیاں کچھ ایسی تھیں کہ وہ اپنی تمام تر توجہ قانون کے پیشے کی طرف نہ دے سکے۔ چناں چہ اس میں کوئی خاص نام پیدا نہ کر سکے لیکن جہاں پیام مغرب کا گوئٹے اس پیشے میں پڑ کر ہمت ہار بیٹھا وہاں ہمارے اقبال اسے آخری عمر تک نبھاتے رہے۔ علامہ اقبال کی آمدنی کبھی ایک ہزار سے زیادہ نہیں بڑھی۔ ملازموں کی تنخواہ وغیرہ نکال کر ۷۰۰ روپے ان کے پاس بچ رہتے تھے۔ جس میں سے کچھ رقم والدین کو بھیج دیتے تھے اور باقی سے اپنا خرچ چلاتے تھے۔ البتہ جن دنوں کالج میں پڑھاتے تھے تو تنخواہ کے طور پر ملنے والے ۵۰۰ روپے تمام کے تمام گھر بھیج دیتے تھے۔" ۳۳

لاہور ہائی کورٹ کے لیے جج کے تقرر کے لیے ۱۹۲۵ء ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا نام گردش کرنے لگا کئی سیاسی حلقوں نے حضرت علامہ محمد اقبال کا نام تجویز کر لیا تھا اور اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اقبال اس عہدہ پر فائز ہو جائیں۔ مگر بدقسمتی سے سر شادی لال اقبال کے حق میں نہ تھے۔ ان کی مخالفت کے باعث اقبال اس اعزاز سے محروم رہے۔ اسی دوران حیدر آباد میں سید ہاشم بلگرامی کے انتقال سے جج کی سیٹ خالی ہوئی تو میونسپل گزٹ لاہور کے ایڈیٹر منشی محمد دین فوق نے اقبال کا نام تجویز کیا۔ نظام

کے سامنے جو نام رکھے گئے ان میں اقبال کا نام بھی شامل تھا۔ کئی علمی وادبی حلقوں کو پختہ یقین تھا کہ اقبال جج بن جائیں گے لاہور کے دو اصحاب جو نظام کے قریبی حلقہ میں سے تھے انھوں نے دلی منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقبال کے نام کی مخالفت کی۔ یوں اقبال اس تقرر سے محروم رہے۔

سر اکبر حیدری نے ۱۹۱۷ء میں اقبال کو قانون کے پروفیسر کے لیے حیدر آباد بلانا چاہا تو اقبال نے انکار کر دیا۔ اسی طرح عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں بحیثیت پرنسپل تقرری کی تجویز پیش ہوئی مگر آپ نے یہ ملازمت بھی نہ کی اور فرمایا کہ "تھوڑی سی رقم کے لیے جلاوطن ہونا کوئی معقول فعل نہیں"

اقبال کی ملازمت نہ کرنے کے حوالے سے ڈاکٹر صابر کلوروی لکھتے ہیں:

"یہ تمام ملازمتیں قبول نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اقبال اپنی اظہار رائے کی آزادی کو کسی بھی قیمت پر قربان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ زندگی کو اپنے نصب العین کی روشنی میں ایک خاص ڈھب سے گزارنے کے لیے انھوں نے چند اصول بنائے ہوئے تھے۔ جن پر عمل کرنے کو وہ ہر چیز پر مقدم سمجھتے تھے۔" ۳۴

اقبال کی سیاسی بصیرت :

علامہ محمد اقبال کا مزاج ہرگز سیاسی نہیں تھا وہ شاعرانہ مزاج کے حامل انسان تھے۔ ان کی طبیعت سیاسی بکھیڑوں سے الجھنا نہیں چاہتی تھی مگر دوست احباب کے کے اصرار پر سیاست کی پرخار وادی میں اترے تھے۔ سیاست میں آنے کا مقصد صرف اور صرف مسلمانوں کی بھلائی اور فلاح و بہبود کرنا مقصود تھا۔ دسمبر ۱۹۰۵ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی اس وقت اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ میں تھے۔ ۱۹۰۸ء میں حصول تعلیم کے بعد واپس آئے تو ان کے کئی قریبی دوست مسلم لیگ کے ممبر بن چکے تھے۔ مرزا جلال الدین سمیت کئی اور احباب بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے کچھ عرصہ بعد اقبال پنجاب پراونشل لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری بن گئے۔

۴۸ افراد پر مشتمل ایک وفد جو یکم اپریل ۱۹۱۱ء کو لارڈ ہارڈنگ سے ملا اور ایک سپاس نامہ پیش کیا ان میں علامہ محمد اقبال بھی شامل تھے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں وہ کسی نمایاں سیاسی تحریک میں شامل نہ ہوئے البتہ تحریک خلافت اور ترک موالات میں بساط بھر حصہ لیا۔

۱۹۲۳ء میں اقبال نے مجلس قانون ساز میں حصہ صرف اور صرف دوستوں کے بھرپور اصرار پر لیا مگر جب انھیں معلوم ہوا کہ میاں عبدالعزیز بھی اسی حلقے سے انتخاب میں حصہ لے رہے ہیں تو انھوں نے اپنا نام واپس لے لیا اور الیکشن میں حصہ نہ لیا۔

۱۹۲۵ء میں جب دوبارہ مجلس قانون ساز الیکشن ہونے والے تھے تو اقبال نے انتخاب میں حصہ لینے کے لیے اپنے کاغذات جمع کروا دیے تو میاں عبدالعزیز نے اس بار الیکشن میں حصہ نہ لیا بل کہ اقبال کی الیکشن مہم میں ان کے لیے کام کرتے رہے۔ ایسی سیاست کرنے والے لوگ موجود تھے۔ آج کل کے سیاست دانوں کو دیکھیں تو ہر سیاست دان دوسرے پر کیچڑ اچھالنے اور ٹانگیں کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اقبال اور ان کے دوستوں کو دیکھیں تو وہ ایک دوسرے کے لیے اپنا نام واپس لے لیا کرتے تھے۔ یہ ہوتا ہے احترام اور یہ ہوتا ہے ایک دوسرے کا خیال............اس وقت کی سیاست اور آج کی سیاست پر نگاہ ڈالیں تو زمین آسمان کا فرق محسوس ہوتا ہے۔

بی بی سی کے ایک نمائندے نے نیلسن منڈیلا سے پوچھا کہ سیاست دان اور راہنما میں کیا فرق ہوتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ سیاست دان اگلے الیکشن کے لیے سوچتا ہے جب کہ راہنما آنے والی نسلوں کے لیے سوچتا ہے۔ علامہ محمد اقبال بھی سیاست دان نہ تھے بل کہ قومی راہنما تھے جو آنے والی نسلوں کے لیے سوچ رہے تھے۔ موجودہ دور میں سیاست دان تو ہیں لیکن راہنماؤں کا فقدان نظر آتا ہے۔

علامہ محمد اقبال کے مد مقابل لاہور بلدیہ کے صدر ملک محمد حسین اور آرائیں برادری کے خان بہادر ملک محمد دین بھی امیدوار تھے۔ ملک محمد حسین تو اقبال کے حق میں دست بردار ہو گئے لیکن ملک محمد دین مقابل رہے۔ لاہور چیف کورٹ کے جج سر شادی لال ملک محمد دین کو اقبال کے مقابلے میں الیکشن لڑنے پر

اکساتے رہے۔ ملک محمد دین اپنے جلسوں میں اقبال کے خلاف کیچڑ بھی اچھالتے رہے مگر اقبال کے جلسوں میں ایسا ہرگز نہ ہوا بلکہ انھوں نے صبر اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اقبال کے مداحوں نے بڑے بڑے قدآور اشتہارات خود شائع کروا کر آویزاں کیے۔

اس انتخاب کے نتیجہ کے حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

"انتخاب کا نتیجہ ۶ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ضلع کچہری میں سنایا گیا۔ ریکارڈ کے مطابق رائے دہندگی کا تناسب (Turn out) ۶۸ فیصد تھا۔ علامہ کو ۵۶۷۵ ووٹ اور مد مقابل کو ۲۴۹۸ ووٹ ملے، یعنی علامہ نے اپنے حریف پر ۳۱۷۷ ووٹوں کی سبقت حاصل کر کے کامیابی حاصل کی۔ علامہ اقبال کے حامیوں نے انھیں ساتھ لے کر اظہار مسرت کے لیے ایک جلوس نکالا اور انارکلی، لوہاری، بھاٹی، ہیرا منڈی، سید مٹھا بازار کے راستے چوک جھنڈا میں پہنچا۔ یہاں ایک صاحب نے خواجہ فیروز الدین بیرسٹر رکن بلدیہ اور علامہ اقبال کے سروں پر پگڑیاں باندھیں۔ علامہ کو فٹن میں سوار کیا گیا اور پھر یہ جلوس پانی والے تالاب، ڈبی بازار، کشمیری بازار، پرانی کوتوالی سے ہوتا ہوا چوہٹا مفتی باقر پہنچا، جہاں کچھ نظمیں پڑھی گئیں۔ رات دس بجے جلوس منتشر ہوا۔ خاصے دنوں تک علامہ کو مبارک باد کے پیغامات اور خطوط موصول ہوتے رہے۔ ان کے اعزاز میں متعدد دعوتوں کا اہتمام بھی کیا گیا" ۳۵

علامہ اقبال تین سال ممبر قانون ساز اسمبلی رہے، وہ اسمبلی میں ہر مسئلے پر ہمیشہ اپنی آزادانہ اور بے لاگ رائے کا اظہار کرتے رہے۔ انھوں نے مسلمانان لاہور کی نمائندگی کا کما حقہ حق ادا کر دیا ہندو مسلم فسادات کی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں اقبال نے قانون ساز اسمبلی میں سکھوں کو کرپان اور مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی اجازت دلا کر کیا۔

علامہ محمد اقبال نے عام آدمیوں کے مسائل کو اسمبلی میں اٹھایا اور ان کے لیے قوانین میں

تبدیلیاں کرواتے رہے۔علامہ محمد اقبال نے سب سے زیادہ کام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے حوالے سے کیا ہے۔انھوں نے دیہاتوں میں صحت وصفائی اور خواتین کے علاج ومعالجے پر زور دیا۔علامہ اقبال نے ہمیشہ جبری تعلیم کے نفاذ پر زور دیا ہے۔

علامہ محمد اقبال نے کبھی کسی کی ناراضی کو خاطر میں نہ رکھا ہمیشہ مظلوم لوگوں کے حق میں آواز اٹھاتے رہے ہیں۔وہ عنان اقتدار کے لوگوں سے کبھی خائف نہ ہوئے۔وہ ہمیشہ با اصول اور بے لاگ سیاست کے راستے پر گامزن رہے۔انھیں ہر حال میں مسلمانوں کا مفاد عزیز تر رہا۔وہ اقلیتوں کے لیے انصاف فراہم کرنا چاہتے تھے۔ان کی خواہش تھی کہ مسلمان ہوں یا ہندو، سکھ ہوں یا عیسائی ہر کسی کو انصاف ملنا چاہیے کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔۔۔بل کہ سب کے لیے انصاف یکساں ہونا چاہیے۔وہ اسی لیے دوسروں کی آنکھوں میں کھٹکتے بھی رہے۔انھیں اسمبلی میں کسی کی تائید یا حمایت حاصل نہ تھی بل کہ تن تنہا وہ انصاف کی جنگ لڑتے رہے۔

علامہ محمد اقبال اس رکن مجلس قانون ساز اسمبلی سے خوش نہ تھے بل کہ وہ اس کو ایک اضافی بوجھ قرار دیتے رہے ہیں۔اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ بے جا خوشامد، چاپلوسی، ارباب اختیار کی ہاں میں ہاں ملانا، انھیں ہرگز پسند نہ تھا۔وہ اصول پسند انسان تھے۔دنیاداری سے بہت دور تھے۔وہ منافقوں کی بھیڑ میں اکیلے حق کا پرچم بلند کرنے والے تھے۔اس لیے ان کی آواز کو ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نے بحیثیت مجموعی واویلا یا پھر نقار خانے میں طوطی کی آواز سے مماثل قرار دیا ہے۔اس پر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> "دراصل اقبال کی طبیعت ہماری سیاست کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی۔وہ دنیا داری، موقع پرستی اور خوشامد سے کوسوں دور تھے اس لیے، اگر ان کی تقاریر کو ڈاکٹر جاوید اقبال نے بحیثیت مجموعی واویلا یا نقار خانے میں طوطی کی آواز قرار دیا تو کچھ بے جا نہیں۔اقبال خود بھی اسمبلی کی رکنیت سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔یہ بے ڈھب اور موقع پرستی کی سیاست ان کے بس کی بات نہ تھی چناں چہ ۱۹۲۹ء میں ان

کے احباب میں اگلی میقات کے لیے رکنیت کا مسئلہ زیر بحث آیا تو اقبال نے بلا تاخیر کہہ دیا کہ وہ رکن بننے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔" ۳۶؎

اسی دوران جنوری ۱۹۲۳ء برطانوی حکومت کی طرف سے "سر" کا خطاب دیا گیا۔ اسی سال علامہ محمد اقبال دوسری بار انجمن حمایت اسلام کے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۳ء کو ان کے فارسی شعری مجموعہ "پیام مشرق" کی اشاعت ہوئی۔ ۱۹۲۴ء کو جاوید اقبال کی ولادت ہوئی۔ اسی سال علامہ محمد اقبال کا مشہور ترین شعری مجموعہ "بانگ درا" منصۂ شہود پر آیا۔

۱۹۲۶ء میں پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے اور اسی سال علامہ محمد اقبال پنجاب لیجسلیٹو کونسل (پنجاب اسمبلی) کے رکن بھی منتخب ہوئے۔

دہلی کا سفر :

مدراس (چنائی) کی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا کی دعوت پر علامہ محمد اقبال جنوری ۱۹۲۹ء کو بذریعہ ریل دہلی روانہ ہوئے۔ مسلم مطالبات کے سلسلہ میں سر محمد شفیع نے کانفرنس میں ایک قرارداد پیش کی جس میں جداگانہ انتخاب، بمبئی سے سندھ کی علیحدگی، سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے برابر آئینی اصلاحات، وفاقی طرز حکومت صوبوں کو تفویض اختیارات اور مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی مسلم نمائندگی کی نیابت کا مطالبہ کیا گیا علامہ اقبال نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ اگر مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان زندہ رہنا ہے تو جلد از جلد ایک سیاسی پلیٹ فارم مہیا کرنا ہوگا۔ اقبال نے اشارہ کیا کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے قیاس ہے کہ ان کے ذہن میں شمالی مغربی ہندوستان میں مسلم مرکزیت کا تصور پرورش پا رہا تھا جو آگے چل کر قرارداد پاکستان کی اساس بنا۔ ۲ جنوری کو دہلی سے فرنٹیر میل کے ذریعے روانہ ہو کر براستہ بمبئی ۵ جنوری کو مدراس پہنچے۔

محمد عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین بھی علامہ محمد اقبال کے اس سفر میں شریک تھے۔ علامہ

محمد اقبال نے مدراس کے صاحب علم عوام کے سامنے تین علمی خطبات دیے جن کا مرکزی موضوع ''اسلام اور اجتہاد'' تھا۔

یہی خطبات میسور اور حیدر آباد دکن کے جلسوں میں پڑھے گئے تھے۔ میسور (سرنگا پٹم) میں علامہ محمد اقبال نے اپنے رفقا کے ہمراہ ٹیپو سلطان شہید کے مزار پر حاضری دی فاتحہ پڑھی اور مسلم سپہ سالار کو خراج تحسین پیش کیا۔ ٹیپو سلطان کے مقبرہ میں داخل ہوتے ہوئے علامہ اقبال نے سب سے پہلے یہ آیت تلاوت کی۔ ترجمہ ''اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مردہ نہ کہو ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں''

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''میسور پہنچ کر اقبال نے میسور یونی ورسٹی میں اہل علم کے سامنے پہلا خطبہ پیش کیا اس جلسے کی صدارت یونی ورسٹی کے وائس چانسلر نے کی تھی۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ علامہ کا مدراس کے لیکچروں کی دعوت کو قبول کرنے کا سب سے بڑا مقصد سلطان ٹیپو کے مقبرے کی زیارت کرنا تھا چناں چہ ۱۱ جنوری کو اقبال رفقائے سفر کی معیت میں ٹیپو سلطان کا مقبرہ دیکھنے گئے'' ۷ے

مقبرے پر حاضری کے دوران علامہ محمد اقبال کی آنکھیں نم دیدہ ہو گئی تھیں وہاں کے ایک مقامی شاعر اور موسیقار علی جان نے موقع کی مناسبت سے چند اشعار ترنم سے پیش کیے۔ اس وقت علامہ محمد اقبال پر رقت طاری ہو گئی تھی۔ علامہ اقبال کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ یہ ساری کیفیت ان کی نظم ''سلطان ٹیپو کی وصیت'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جو ان کی کتاب 'ضرب کلیم' میں شامل ہے۔

تُو رہ نوردِ شوق ہے ، منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدہ کائنات میں
محفل گداز گرمی محفل نہ کر قبول

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو ، وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے ، حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

(نظم "سلطان ٹیپو کی وصیت" مشمولہ "ضرب کلیم" ص ۵۸۶)

علامہ محمد اقبال کو سلطان ٹیپو شہید سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ان کی اس محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے اُردو اور فارسی کلام میں کئی جگہ پر سلطان ٹیپو کا ذکر نہایت احترام سے کیا ہے۔"جاوید نامہ" میں ٹیپو سلطان کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آں شہیدان محبت را امام
آبروئے ہند و چین و روم و شام

نامش از خورشید و مہ تابندہ تر
خاک قبرش از من و تو زندہ تر

عشق رازے بود بر صحرا نہاد
تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد

از نگاہ خواجہ بدر و حنین
فقر و سلطاں وارث جذب حسین

رفعت سلطاں زیں سرائے ہفت روز
نوبت او در دکن باقی ہنوز

میسور سے حیدر آباد دکن سے ہوتے ہوئے علامہ محمد اقبال ۱۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو واپس لاہور پہنچے۔ ۱۹۲۹ء میں ہی علامہ اقبال نے تین مزید خطبات تیار کیے جو انھوں نے نومبر ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے علمی واجتماعات میں پیش کرنا تھے۔ عام طور پر یہ چھ فلسفیانہ خطبات Six Lectures کے نام سے معروف ہوئے اس میں ایک خطبے کا اضافہ کر کے ۱۹۳۰ء میں The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے شائع ہوئے۔ ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء حضرت علامہ محمد اقبال کے والد گرامی شیخ نور محمد کا انتقال ہوا ان کی عمر تقریباً ۹۰ سال تھی۔

خطبہ الہ آباد:

علامہ محمد اقبال سیاست دان نہیں بل کہ راہنما تھے ان کی دور بیں نظروں نے مسلمانوں کا تاریک مستقبل دیکھ لیا تھا انھیں نظر آ رہا تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندوؤں نے مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھنے کی سازشیں تیار کر لی تھیں۔ علامہ ان چالوں کو جان چکے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ ہندوستان میں

مسلمانوں کی اکثریت والے علاقوں میں مسلمانوں کی ایک الگ ریاست کے قیام کا خواب دیکھنے لگے تھے جب کہ دوسری طرف مسلم لیگ کی تنظیمی صورت حال انتہائی افسوس ناک رہی۔ اراکین اور عہدیداران کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ۱۹۲۹ء میں پارٹی کا سالانہ اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ کئی ماہ تک معتمد اعزازی کا عہدہ خالی رہا۔ قائداعظم محمد علی جناح ہندوستانی سیاست سے بددل ہو کر انگلستان چلے گئے تھے۔ مسلم لیگ کی ابتری اور انتشار کا شکار تھی۔ اس مایوس کن صورت حال کے باوجود علامہ محمد اقبال مسلمانوں کا مستقبل سنوارنے کے لیے نہ صرف پرعزم تھے بل کہ آخری اور واحد سہارا بھی تھے۔ اس مایوس کن صورت حال میں اقبال اندھیرے میں ایسا دیپ ثابت ہوئے جنھوں نے اندھیروں میں روشنی اور بجھے دلوں کی آس بندھائی اور مسلمانانِ ہند کو آنے والے دنوں کی بشارت دیتے ہوئے ان کے مستقبل کو روشن کرنے کے لیے سرگرم تھے

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو صبح گیارہ بجے محلہ یاقوت گنج کے ایک دومنزلہ مکان میں اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت حضرت علامہ محمد اقبال نے فرمائی نواب محمد اسماعیل خان، سیٹھ عبداللہ ہارون، مولانا عبدالمجید سندھی مولانا عبدالماجد، سید محمد حسین کے استقبالیہ کلمات کے بعد علامہ اقبال نے انگریزی زبان میں خطبہ پڑھنا شروع کیا جس کی متعدد کاپیاں سامعین میں تقسیم کی گئیں۔

خطبہ میں اقبال نے پاکستان کا نام نہیں لیا ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست کا مطالبہ کر دیا گیا تھا ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> "اقبال نے خطبے میں "پاکستان" کا نام نہیں لیا، مگر ان کی تجویز میں "پاکستان" کی روح موجود ہے ویسے لفظ "پاکستان" تو قرارداد لاہور میں بھی موجود نہیں۔ لہٰذا اگر کچھ لوگوں نے اسے خود مختار اسلامی ریاست کا مطالبہ سمجھا تو یہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ ۱۷ برس بعد، ان کی وہ پیش گوئی پوری ہوئی جس پر ہندو ہی نہیں، برطانیہ کے وزیر اعظم ریمزے میک ڈونلڈ بھی سخت برہم ہو گئے تھے۔" ۲۸

کل ہند مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں علامہ محمد اقبال نے وہ تاریخی خطبہ پیش کیا جو بعد میں خطبہ

الہ آباد کے نام سے معروف ہوا۔ یہ تاریخی خطبہ علامہ محمد اقبال نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو ہندوستان کے شہر الہ آباد میں دیا تھا۔ علامہ محمد اقبال نے نہ صرف تاریخی خطبہ دیا بلکہ الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جداگانہ ریاست کے قیام کا نظریہ پیش بھی کیا۔

ڈاکٹر صابر کلوروی لکھتے ہیں:

"ایک الگ اسلامی مملکت کے حصول کے لیے تاریخ کا ایک اہم موڑ اقبال کا وہ خطبہ تھا جو انھوں نے مسلم لیگ کے الہ آباد کے اجلاس میں دیا۔ ایک طرف ہمارے سیاسی رہنما انگلستان میں گول میز کانفرنس میں بیٹھ کر مسلمانوں اور ہندوؤں کو متحد کر کے کسی مشترکہ اور متفقہ لائحہ عمل کے لیے کوشاں تھے تو دوسری طرف اقبال الہ آباد میں واشگاف الفاظ میں ہمیں یہ بتا رہے تھے کہ ایک الگ اسلامی مملکت کا قیام ہندوستان کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے اس شہر کو یہ سعادت نصیب ہے کہ پاکستان کے لیے سب سے پہلی آواز اسی شہر سے اٹھی تھی۔"۹ے

جس جگہ مسلم لیگ کا یہ سالانہ اجلاس ہوا اور جس میں علامہ اقبال نے خطبہ الہ آباد دیا وہ حویلی نما وسیع مکان ہے جس کے صحن یا ہال کے چاروں طرف ۱۲ دروازے برآمدے کی طرف کھلتے ہیں۔ مسلمانوں کے اکثر اجلاس اور مشاعرے وغیرہ منعقد ہوتے رہتے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس تاریخی حویلی کو اب ۱۹۷۷ء کو گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کے صحن میں ایک گائے بندھی ہوئی سست رفتاری سے جگالی کر رہی تھی۔ اس تاریخی حویلی کو ایک یادگار کے طور پر حفاظت سے رکھنے کی ضرورت تھی مگر ہندو مسلمانوں کی کسی نشانی یا یادگار کو زندہ و سلامت رکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔

الہ آباد کی اس قدیم اور تاریخی حویلی کو بھی گودام کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اور وہاں گائے اور دیگر جانور باندھے جاتے رہے۔ یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے اب شاید اس سے بھی برا حال ہو۔ ممکن ہے کہ

یہ عمارت بھی سلامت نہ رہی ہو۔

اس عمارت کے حوالے سے ڈاکٹر صابر کلوروی رقم طراز ہیں:

''الٰہ آباد کے سیاسی اجلاس عموماً شہر سے باہر ایک وسیع باغ میں ہوا کرتے تھے لیکن شرکاء کی تعداد میں ممکنہ کمی کے پیش نظر یہ اجلاس محلہ یاقوت گنج میں شیر شاہ سوری روڈ پر ایک مکان دوازدہ منزل میں ہوا جو شہر کے ممتاز تاجر شیخ رحیم بخش کی ملکیت تھا۔ علامہ جب بذریعہ ریل الٰہ آباد پہنچے تو ان کا تاریخی استقبال ہوا۔'' ۸۹

حضرت علامہ محمد اقبال کا والہانہ استقبال ہوا ایک بڑے جلوس کی صورت میں یہ کارواں ساؤتھ روڈ الٰہ آباد سر محمد یوسف کی کوٹھی پہنچا جہاں علامہ محمد اقبال نے قیام کیا۔ علامہ اقبال سے ملنے والوں کا رات گئے تک تانتا بندھا رہا۔ علامہ محمد اقبال کو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو صبح گیارہ بجے خطبہ پیش کرنا تھا۔ جسے بعد میں خطبہ الٰہ آباد کا نام دیا گیا۔

علامہ محمد اقبال نے خطبہ الٰہ آباد کے اہم نکات کیا تھے اس حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''(۱) اسلام ایک زندہ قوت ہے جو ہمیں جغرافیائی حدود سے آزاد کر سکتی ہے۔
اسلام ایک کل ہے، جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر محیط ہے اور یہ دین اور سیاست کی دوئی کا قائل نہیں۔

(۲) ہندستانی قوم کا اتحاد ہی برطانوی غلامی سے نجات کی بنیاد بن سکتا ہے، اس لیے ہندو مسلم اتحاد وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

(۳) مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا اصول ضروری بل کہ ناگزیر ہے۔

(۴) میری خواہش ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے (خیبر پختونخوا)

سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔

خطبے کی نوعیت زیادہ تر علمی تھی تاہم "ایک مسلم ہندوستان" کی تجویز پر سب نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔" [۱۳]

قیام پاکستان کی اساس میں یہ خطبہ الٰہ آباد اہمیت رکھتا ہے۔ یہ خطبہ خیالات کی وسعت اور بلندی لہجے کی صداقت، زبان کی دل فریبی اور مطالب سیاسی کی فراوانی کے اعتبار سے نہایت شاندار اور بے نظیر تھا۔ یہ وہی خطبہ ہے جو آگے چل کر پاکستان کی بنیاد بنا۔ علامہ محمد اقبال نے بڑے واضح الفاظ میں ایک خود مختار اسلامی ریاست کا مطالبہ کر دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ کون کونسے علاقے اس ریاست میں شامل کر دیے جائیں۔ پاکستان کا نام لیے بغیر پاکستان کا ایک نقشہ پیش کر دیا تھا۔ بعض تعصب زدہ ہندوؤں نے اس خطبہ کا مذاق اڑایا۔ کئی ہندو اخبارات میں اس کے خلاف بھی لکھا گیا۔ مگر رب العزت کو کچھ اور ہی منظور تھا ےا سال بعد مسلمانان ہند کی امیدیں بر آئیں اور ایک آزاد اسلامی خود مختار مملکت وجود میں آ گئی۔ یہی وہ نقشہ تھا جو اقبال نے خطبہ الٰہ آباد میں پیش کر دیا تھا۔

دنیا کے نقشے پر ایک اسلامی مملکت کا وجود ابھر آیا تھا۔ علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح راہنما تھے اس کے بعد جو بھی آیا ہے وہ راہنما نہیں بل کہ سیاست دان ہی آیا ہے۔ جس نے اس مملکت خداداد کو لوٹنے کی کوشش کی ہے۔ جتنا نقصان اس ملک کو ہمارے سیاست دانوں نے پہنچایا ہے شاید ہی کسی نے پہنچایا ہو۔ یہ ملک کلمہ طیبہ کے نام پر قائم ہوا تھا اسی لیے قائم و دائم ہے اور قیامت تک قائم و دائم رہے گا۔

علامہ محمد اقبال نے وہ تاریخی اور ان مٹ الفاظ دہرائے جو پاکستان کی پیشانی کا جھومر ثابت ہوئے۔ انھوں نے فرمایا:

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست (صوبہ) بنا دی جائے، مجھے تو اب نظر آتا ہے کہ کم از کم ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک مربوط مسلم ریاست خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے

اندر حکومت خود مختاری حاصل کرے یا اس کے باہر، ہندوستان کے شمال مغربی مسلمانوں کا آخر کار مقدر ہے۔ اسلام کو بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ اس سے ان کا احساس ذمہ داری قومی اور حب الوطنی کا جذبہ گہرا ہو جائے گا۔ ہندوستان کے جسد سیاسی کے اندر رہتے ہوئے اگر انھیں نشوونما کا پورا موقع دیا گیا تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان بیرونی حملوں کے خلاف خواہ وہ سنگینوں سے کیے جائیں یا افکار سے ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔"

اس خطبہ کے بعد لوگوں نے علامہ محمد اقبال سے شعر سنانے کی فرمائشیں کرنے لگے علامہ ایک سنجیدہ فکر انگیز خطبہ کے بعد شعر کے لیے قطعاً تیار نہ تھے مگر بھرپور اصرار پر انھوں نے خودی کے موضوع پر چند اشعار پیش کیے۔ ابھی مزید کلام پیش کرنے کا شور بلند ہو رہا تھا اسی اثنا علامہ نے ایک حدیث مبارکہ سنا کر اجازت چاہی۔ حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے:

"جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا"

خطبہ کے بعد علامہ محمد اقبال اپنی نشست پر بیٹھ گئے اور مولوی یعقوب نے آپ کے خطبے کا اردو میں خلاصہ پیش کیا۔ تاکہ تمام لوگوں تک خطبہ کی غرض و غایت پہنچ سکے۔ علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد مسلمانوں کے لیے آزادی کا چارٹر بن گیا۔ ہندو اپنی رپورٹ پر خود ہی شرمندہ ہو گئے۔ خطبہ الٰہ آباد نے اس رپورٹ کے تابوت میں آخری کیل لگا دی۔

دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت:

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بن چکے تھے، قبل ازیں تحریک خلافت کی وجہ سے برعظیم پاک و ہند میں سیاسی بیداری کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ نہرو نے اس سیاسی کشمکش کا حل اپنی

ایک رپورٹ میں پیش کیا۔ اس رپورٹ کو "نہرو رپورٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں مسلمانوں نے اس رپورٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے جواب میں محمد علی جناح کے چودہ نکات منظر عام پر آئے۔ مسلمان ان نکات کی حمایت کرنے لگے۔ یہ بات غلط نہ ہوگی کہ آزادی کا پہلا چراغ یہ چودہ نکات کی صورت میں منور ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں خطبہ الٰہ آباد نے کاروان آزادی کو مہمیز لگا دی۔ اسلام دشمن قوتیں اور حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کی اس بیداری کو روکنے کے لیے گول میز کانفرنسوں کا اہتمام کیا۔ تاج برطانیہ نے آزادی کے متوالوں کا راستہ روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال مسلمانوں کی بیداری کے لیے مصروف عمل رہے۔

سلطنت برطانیہ نے ایک ایسے وقت یہ کانفرنس منعقد کی جب کانگریس کا موقف تھا کہ حکومت برطانیہ نے اگر نہرو رپورٹ کو آئندہ آئین کی حیثیت سے تسلیم نہ کیا تو ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے گی۔ حکومت برطانیہ نے یہ کانفرنس صرف اس لیے رکھی کہ ہندوستان کے آئینی مسائل کے لیے کوئی حل تلاش کیا جائے اور کوئی متفقہ قابل عمل لائحہ عمل تیار کیا جائے جب کہ کانگریس نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا جس پر ان کے کئی نام ور لیڈر گرفتار بھی ہوئے۔ جبکہ مسلمان راہنماؤں نے اس کانفرنس میں شرکت کی ان میں مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی، سر آغا خان، علامہ محمد اقبال اور محمد علی جناح شامل تھے۔ علامہ محمد اقبال تقریباً ۲۳ سال بعد لندن کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ لندن کی علمی و ادبی تنظیموں نے ان کے اعزاز میں عشائیے، تقریبات اور دیگر اجتماعات کا اہتمام بھی کیا۔

علامہ محمد اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے یکم اگست کو ممبئی پہنچنا چاہتے تھے تاکہ ۵ اگست کو بحری جہاز کے ذریعے لندن روانہ ہو سکیں مگر یہ سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا کیوں کہ علامہ محمد اقبال کو تیز بخار نے آ لیا۔ اس لیے وہ ۸ ؍ اگست کو لاہور سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے جہاں کوئی تین ہزار افراد نے آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ پھولوں کے ہار ڈالے

گئے، اس سفر میں آپ کا ملازم علی بخش بھی ہمراہ تھا۔ ممبئی میں آپ خلافت ہاؤس میں ٹھہرے۔ اسی روز سہ پہر کو محترمہ عطیہ فیضی نے آپ کے اعزاز میں ٹی پارٹی دی۔ ۱۲ اگست ۱۹۳۱ء ممبئی سے ''ملوجا'' نامی جہاز کے ذریعے انگلستان روانہ ہوئے۔ دوران سفر ۲۰ اگست کو دن تین بجے عدن کی بندرگاہ پر رکے۔

۲۷ راگست ۱۹۳۱ء کو انگلستان پہنچے۔ مولانا غلام رسول مہر بھی یورپ سے ہوتے ہوئے انگلستان پہنچ گئے۔ لندن میں اقبال کی رہائش کا بندوبست جیمز کورٹ میں کیا گیا اس کے نزدیک ہی وہ جگہ سینٹ جیمز پیلس تھا جہاں گول میز کانفرنس منعقد ہوتا تھی۔ لندن میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے علاوہ کئی علمی وادبی تقریبات میں بھی علامہ اقبال نے شرکت کی۔ کئی دعوتوں میں بھی شریک ہوئے۔ لندن سے ذرا فاصلے پر موجود مسجد شاہ جہاں ووکنگ کے امام مولانا فرزند علی نے کانفرنس کے مسلمان شرکاء کے اعزاز میں لنچ کا اہتمام کیا۔ جس میں ایک انگریز نوجوان عبدالرحمٰن ہارڈی نے خوبصورت عربی لہجے میں تلاوت کی سعادت حاصل کی۔ ایک چھ سالہ بچی نے سورہ فاتحہ کی تلاوت کی تو علامہ اقبال نے ایک پاؤنڈ انعام کے طور پر بچی کو پیش کیا۔ ۳ نومبر ۱۹۳۱ء کو انڈیا سوسائٹی میں ''فلسفہ اور شعر'' کے موضوع پر لیکچر دیا اس کے علاوہ لندن کی ''اقبال کی لٹریری ایسوسی ایشن نے علامہ اقبال کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا جس میں تقریباً چار سو افراد نے شرکت کی۔ کھانے کے بعد ایک اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت سر شیخ عبدالقادر نے کی۔ اس تقریب میں پروفیسر نکلسن نے بھی شرکت کی بلکہ تقریر بھی کی۔ یہ وہی پروفیسر نکلسن ہیں جنہوں نے علامہ اقبال کی کتاب ''اسرار خودی'' کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور اسے یورپ میں خوب متعارف کروایا تھا۔ سر عبدالقادر نے خطبہ صدارت میں کہا: ''آج ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ سرزمین مشرق کا سب سے بڑا شاعر اور فلسفی ہمارے درمیان موجود ہے۔ جس کے اعزاز میں ہم سب یہاں جمع ہیں۔'' اسی اجلاس میں سروجنی نائیڈو نے بھی تقریر کی۔

دوسری گول میز کانفرنس کے احوال کے بارے میں ڈاکٹر صابر کلوروی لکھتے ہیں:

''دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی نے اپنی ساری صلاحیتیں اس بات کو

ثابت کرنے میں صرف کر دیں کہ مسلمان ہی برصغیر میں تمام ہنگامہ آرائی کے ذمہ دار ہیں اور وہی آئینی مسائل کے سلسلے میں کسی فیصلے پر پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ چناں چہ گاندھی جی کی اس ہٹ دھرمی سے دوسری گول میز کانفرنس مفید نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ اقبال نے اس کانفرنس کی فیڈرل سب کمیٹی کی کارروائی میں حصہ نہیں لیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کوئی حکومت بنانے کے حق میں نہیں تھے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی عددی کثرت کی وجہ سے مسلمان ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن کر رہ جائیں گے اور یوں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے جس کام کی ابتداء انھوں نے کر دی تھی، اس کا پورا ہونا ناممکن دکھائی دیتا تھا پہلے پہل تو دوسرے مسلمان مندوبین نے بھی اقبال کے اس فیصلے کی تائید کی لیکن بعد میں شاید برطانوی حکومت کے دباؤ کی وجہ سے انھوں نے کانفرنس کی کارروائی میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اقبال کو مسلمان ممبروں کی اس منافقت پر بڑا دکھ ہوا۔" ۴۲

دوسری گول میز کانفرنس کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

"لندن کا یہ دورہ زیادہ سود مند ثابت نہ ہوا۔ گول میز کانفرنس میں انگریزوں اور ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں" اور گاندھی جی کی "غیر منصفانہ" شرائط کی وجہ سے اقبال بے حد مایوس ہوئے۔ خود مسلم وفد کی سرگرمیوں نے بھی اقبال کو بہت رنجیدہ کیا چناں چہ ۱۶ نومبر کو وہ کانفرنس سے لاتعلق ہو گئے اور ۲۱ نومبر کو غلام رسول مہر کے ساتھ پیرس کے راستے لندن سے روم روانہ ہو گئے۔" ۴۳

اقبال ابھی لندن میں ہی مقیم تھے کہ جاوید اقبال کا ایک خط انہیں ملا جس میں گراموفون کی فرمائش کی گئی تھی۔ اقبال نے فرمائش تو پوری نہ کی تاہم ایک غزل لکھ کر ارسال کر دی۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

(بالِ جبریل)

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد ۲۰ نومبر ۱۹۳۱ء کو طاس گک جہاز کے ذریعے اٹلی کے لیے روانہ ہوئے۔ ۲۲ نومبر کو پونے آٹھ بجے روم پہنچے ان کے دوست سکارپا بھی انہیں لینے آئے۔ اقبال کو اٹلی کے ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ روم میں دو روز قیام اور تاریخی مقامات دیکھنے اور علمی و ادبی شخصیات سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۲۳ نومبر کو مشہور دانش ور پروفیسر جنٹلی سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی، وہ آپ کی گفت گو سے بہت متاثر ہوا۔ جنٹلی نے بعد میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اقبال کے بارے میں کہا کہ "ایسے اچھوتے نادر اور پُر از حقائق خیالات کا آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا" ۲۴ نومبر کی دوپہر کو افغانستان کے امان اللہ خان غازی سے ملاقات ہوئی جو تین گھنٹے جاری رہی جس میں انگلستان اور عالم اسلام کا مستقبل خاص طور پر زیر بحث رہے۔ ۲۶ نومبر کو رائل اکیڈیمی میں

علامہ محمد اقبال نے ایک لیکچر دیا۔ اٹلی کے مطلق العنان حکمران مسولینی نے اقبال سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اقبال ان کی دعوت پر ملنے چلے گئے۔ مسولینی سے ملاقات پر اس نے اٹلی کے بارے میں اقبال کے تاثرات جاننا چاہے، اس حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ

"اقبال نے کہا: یورپ سے منہ موڑ کر مشرق کا رخ کرو، یورپ کا اخلاق ٹھیک نہیں ہے مشرق کی ہوا تازہ ہے اس میں سانس لو۔

پھر مسولینی نے پوچھا: کوئی اور مفید مشورہ دیجئے۔ اقبال نے کہا ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اسے حد سے نہ بڑھنے دو۔ جب آبادی مقررہ حد سے تجاوز کرے تو دوسرا شہر آباد کرو آبادی بڑھنے سے شہر کی تہذیبی اور اقتصادی توانائی کم ہو جاتی ہے اور ان کی جگہ محرکات (Evil Forces) سرزور پکڑتے ہیں۔

اقبال نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میرے پیغمبر ﷺ نے یہ ہدایت تیرہ سو سال قبل فرمائی تھی۔ یہ بات سنتے ہی مسولینی بے حد متعجب ہوا اور کہنے لگا: کیسا شاندار خیال ہے۔" ۲۴

مسولینی سے ملاقات کے بعد مسولینی اقبال کے علم و دانش سے متاثر ہوا۔ حضرت علامہ محمد اقبال نے مسولینی پر ایک بھرپور نظم کہی جو "بالِ جبریل" میں شامل ہے۔ اس نظم "مسولینی" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے، ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے، ملت کا شباب

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب

یہ محبت کی حرارت ، یہ تمنا ، یہ نمود
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب

نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب

فیض یہ کس کی نظر کا ہے، کرامت کس کی ہے
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب !

(''مسولینی''،بالِ جبریل)

اس ملاقات کے تقریباً چار برس بعد یعنی ۱۹۳۵ء میں مسولینی نے حبشہ پر حملہ کر دیا۔ یہ سراسر جارحیت تھی اقبال نے نظم ''ابی سینا'' لکھ کر مسولینی کی اس جارحیت کے خلاف آواز بلند کی اور اس اقدام کی سخت مذمت کی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہر ناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردہ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال ، شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش

ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش
اے وائے آبروے کلیسا کا آئینہ
روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش
پیر کلیسا ! یہ حقیقت ہے دل خراش!

چند روز بعد علامہ محمد اقبال نے ''مسولینی'' کے عنوان سے ایک اور نظم لکھ کر مسولینی کی زبان سے مغربی استعمار پر اس طرح تنقید کی۔

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشت دہقاں، تم نے لوٹے تخت و تاج

پردہ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

۲۹ نومبر کو علامہ محمد اقبال، مولانا شفیع داؤدی اور غلام رسول مہر کے ہمراہ اٹلی کی بندرگاہ برنڈزی سے ''وکٹوریا'' جہاز کے ذریعے مصر کی طرف روانہ ہوئے۔ یکم دسمبر کو حضرت علامہ اقبال اسکندریہ پہنچے۔ مصر کی مختلف علمی و ادبی تنظیموں علاوہ جمعیت المسلمین کے ارکان نے ان کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔

مصر میں پانچ روزہ قیام میں علامہ محمد اقبال سے لاتعداد شخصیات نے ملاقات کی۔ علامہ اقبال قاہرہ بھی گئے اور تاریخی مقامات کی سیر بھی کی۔ اہرام مصر کو دیکھنے کے لیے بھی تشریف لے گئے۔ علامہ محمد اقبال نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مؤقف کے بارے میں بہت غلط فہمیوں کو پھیلایا گیا ہے اور کئی صحافی حضرات اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مصر میں علامہ محمد اقبال سے ملنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مصر میں وہ پانچ دن تک مقیم رہے۔اس دوران میں وہ قاہرہ بھی گئے جہاں بہت سے حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں،ان میں علامہ رشید رضا (مدیر: المنار)، سلیمان فوزی (مدیر: کشکول)، محمد حسین ہیکل (مدیر: السیاستہ) کے علاوہ ڈاکٹر منصور فہمی، مصطفیٰ بے عبدالرزاق، عبدالوہاب عزام پاشا، ڈاکٹر عبدالرحمٰن شہبن بدرو غیرہ شامل تھے۔" ۵۲

۴ دسمبر کی شام کو علامہ اقبال نے "شبان المسلمین" کے دفتر میں انگریزی زبان میں تقریر کی۔ تقریر کے دوران خوب داد ملتی رہی۔اجلاس کے اختتام پر چند کتابوں کا تحفہ انہیں پیش کیا گیا۔اسی شام محمد علی پاشا سے بھی ملاقات ہوئی۔۵ دسمبر کو مقامات مقدسہ دیکھنے کا پروگرام بنایا گیا۔پہلے مسجد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ گئے مسجد کے جنوب میں فسطاط کا شہر آباد ہے اور تھوڑے ہی فاصلے پر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار واقع ہے۔حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر علامہ اقبال تلاوت قرآن پاک کرتے رہے۔یہاں سے فراغت کے بعد جامعہ ازہر گئے وہاں منطق، تفسیر اور حدیث کے دروس میں شریک ہوئے جامعہ ازہر کی طرف سے آپ کو کتابوں کا تحفہ پیش کیا گیا۔

اقبال کا سفر بھوپال:

علامہ اقبال ۹ مئی ۱۹۳۱ء کو مولانا غلام رسول مہر کی معیت میں بھوپال گئے۔"قصر راحت" میں قیام کیا اسی روز گیارہ بجے نواب حمید اللہ خان سے ملاقات ہوئی۔اس ملاقات میں ہندوستان کے سیاسی مسائل پر تفصیلی تبادلہ خیال ہوا۔

دوسری مرتبہ بھوپال بغرض علاج گئے جب ان کی آواز بیٹھ گئی تھی حکیم نابینا کے علاج سے ان کی جسمانی صحت تو بہتر ہوئی لیکن گلے کی تکلیف میں افاقہ نہ ہوا۔بعض ملنے والوں نے علامہ اقبال کو بھوپال کے حمیدیہ ہسپتال میں علاج کا مشورہ دیا۔راس مسعود اور نواب صاحب دونوں کی خواہش تھی کہ اقبال بھوپال

آ کر اپنا علاج کروائیں۔ چناں چہ راس مسعود کی دعوت پر ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو بھوپال تشریف لے گئے۔ راس مسعود ان دنوں بھوپال میں وزیر تعلیم تھے۔ نواب بھوپال بضد رہے کہ اقبال شاہی مہمان خانے میں قیام پذیر رہیں مگر اقبال نے عذر پیش کیا کہ وہ بھوپال راس مسعود کی دعوت پر آئے ہیں لہٰذا رہائش بھی ان کے پاس ہی رہے گی۔ راس مسعود نے انہیں ریاض منزل ٹھہرایا۔ اقبال کی کئی نظمیں اور قطعات اسی ریاض منزل پر مکمل ہوئیں۔ نواب بھوپال کے ملٹری سیکرٹری کرنل محمد خان ہمہ وقت اقبال کے ساتھ رہتے تاکہ انہیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو۔ علامہ محمد اقبال ہمیشہ دو کتابیں اپنے ہمراہ رکھتے ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوان غالب۔ اس سفر میں بھی یہ دونوں کتب ان کے ہمراہ تھیں۔ حمیدیہ ہسپتال میں ان کے تفصیلی معائنے ہوئے۔ نواب بھوپال بھی تیمارداری کے لیے آتے رہے۔ اقبال کا یہ دورہ ایک ماہ سات دن کا تھا۔ اس علاج سے ان کی آواز میں تھوڑا بہت فرق محسوس ہوا۔ ڈاکٹروں نے مزید علاج کا مشورہ دیا مگر علامہ اقبال کی بیگم سخت بیمار ہوئیں اور انھیں بھوپال سے لاہور جانا پڑا۔

تیسری مرتبہ ۱۵ جولائی ۱۹۳۵ء کو علامہ اقبال لاہور سے روانہ ہوئے تو ان کے ہمراہ ان کے صاحبزادے جاوید اور علی بخش بھی تھے۔ آپ دہلی سے ہوتے ہوئے ۱۷ جولائی کو بھوپال پہنچے اور ۲۸ اگست ۱۹۳۵ء بھوپال میں قیام کیا۔ اس مرتبہ انہیں سرکاری قیام گاہ "شیش محل" ٹھہرایا گیا۔ اس قیام کے دوران علامہ اقبال کے کئی معروف نظمیں لکھیں۔

۲۹ فروری ۱۹۳۶ء علامہ اقبال چوتھی دفعہ بھوپال کے لیے تشریف لے گئے یکم مارچ ۱۹۳۶ء کو دہلی پہنچے۔ کچھ دیر کے لیے وہ کابل کے قونصل جنرل سردار صلاح الدین سے ملاقات کی۔ رات کی ٹرین سے وہ بھوپال کو روانہ ہوئے ۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو بھوپال پہنچے۔ اس مرتبہ بھی وہ شیش محل میں قیام پذیر ہوئے۔ بھوپال کی معزز شخصیات سے ملاقات رہی اس کے لیے گلے کے علاج کے سلسلہ میں بجلی کا تیسرا کورس بھی مکمل کروایا۔ علی بخش بھی ان کے ہمراہ تھا۔ ریاست بھوپال کی طرف سے ایک سرکاری موٹر کار بھی فراہم کر دی گئی تھی۔

سید راس مسعود سے علامہ اقبال کی دوستی اس لیے بھی تھی کہ وہ سرسید احمد خان کے پوتے تھے۔ وہ مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال بھی کرتے رہے۔ جب راس مسعود کا انتقال ہوا تو علامہ اقبال کو شدید صدمہ ہوا انھیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کا کوئی بہت ہی قریبی رشتہ دار رخصت ہوا ہو۔ علامہ اقبال نے راس مسعود کے مزار کے کتبہ کے لیے ایک قطعہ بھی لکھا جو پیام مشرق میں شامل ہے۔

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
زبند این و آں آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمے چند
گلاں را آب و رنگے دادہ رفتم

(پیام مشرق، لالہ طور)

اس کے علاوہ علامہ محمد اقبال نے ایک طویل نظم "مسعود مرحوم" کے عنوان سے بھی لکھی جو ان کی کتاب "ارمغان حجاز" میں موجود ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ مہر و مہ، یہ ستارے یہ آسمان کبود
کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود

خیال جادہ و منزل فسانہ و افسوں
کہ زندگی ہے سراپا رحیل بے مقصود

رہی نہ آہ، زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگار کمالات احمد و محمود

زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاع گراں بہا مسعود

مجھے رلاتی ہے اہل جہاں کی بیدردی
فغان مرغ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود

نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

نہ مجھ سے پوچھ کہ عمر گریز پا کیا ہے
کسے خبر کہ یہ نیرنگ و سیمیا کیا ہے
خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

(مسعود مرحوم، ارمغان حجاز)

مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت:

۶ دسمبر ۱۹۳۱ء کو بیت المقدس پہنچے۔ قاہرہ سے بیت المقدس کا سفر تقریباً تیرہ گھنٹوں کا ہے۔ بیت المقدس میں مؤتمر عالم اسلامی (اسلامی کانفرنس) کے اجلاس میں شرکت کی جب کہ مولانا محمد شفیع داؤدی، مولانا غلام رسول مہر اور حافظ عبدالرحمٰن بھی ان کے ہمراہ تھے۔ مفتیٔ اعظم فلسطین، امین الحسینی، مولانا شوکت علی اور دیگر اکابر نے استقبال کیا۔ علامہ محمد اقبال کو گرانڈ ہوٹل میں آپ ٹھہرایا گیا۔

مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں مراکش، مصر، یمن، شام، عراق، فرانس، اور جاوا سمیت ۲۷ / اسلامی ممالک کے مندوبین اور نمائندگان نے شرکت کی۔ قبلہ اول پر دنیا بھر کے ارباب علم و فضل بھی تھے، ملی و سیاسی راہنما بھی جمع تھے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

"فلسطین میں اقبال کا قیام نو روز رہا۔ یہ شب و روز شدید مصروفیت میں گزرے اس سفر کا اصل مقصد مؤتمر عالم اسلامی (اسلامی کانفرنس) میں شرکت تھا۔ مؤتمر اس سے قبل بھی دو بار منعقد ہو چکی تھی۔ پہلی مؤتمر قاہرہ میں محدود پیمانے پر ہوئی تھی۔ دوسری مؤتمر ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود نے مکہ معظمہ میں منعقد کی تھی۔ اگرچہ پہلی مؤتمر کی نسبت اس میں نمائندگی زیادہ تھی، تاہم اس میں بھی چند ممالک کے نمائندے شامل نہ ہو سکے تھے اور موضوع بھی مسئلہ حجاز تک محدود رہا۔ موجودہ کانفرنس کے داعی سید امین الحسینی، مفتی اعظم فلسطین تھے، اور یہ نسبتاً بڑے پیمانے پر ہو رہی تھی۔ اس میں تقریباً ۲۷ ملکوں اور علاقوں کے مندوبین شامل تھے۔ ان میں ارباب علم و فضل بھی تھے اور سیاسی اور ملی راہ نما بھی۔ اسی طرح متعدد واجب الاحترام بزرگ شخصیات اور مجاہدین آزادی اور اپنے اپنے ملکوں کی سیاست میں سرگرم ممبران پارلیمنٹ بھی۔ گویا قبلۂ اوّل کے شہر میں عالم اسلام کی منتخب شخصیتیں جمع تھیں۔" ۶ے

۶ دسمبر کو مؤتمر کا افتتاحی اجلاس ہوا جو ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ اس کے بعد تمام شرکاء مسجد اقصیٰ کی جانب روانہ ہوئے، راستے میں مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ پھر مسجد اقصیٰ میں نماز مغرب ادا کی۔ نماز عشاء کے بعد مفتی سید امین الحسینی نے خطبہ پڑھا ان کے بعد علامہ محمد اقبال نے تقریر کی۔ علامہ محمد اقبال کا فلسطین میں نو روزہ قیام رہا۔ اس میں وہ بے حد مصروف تھے۔ انہیں جب بھی موقع

ملتا وہ مقامات مقدسہ اور تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے نکل جاتے۔ ان کے ہمراہ معروف شخصیات بھی ہوتیں۔ علامہ محمد اقبال نے اس سارے سفر سے متاثر ہو کر نظم "ذوق و شوق" بھی لکھی۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردہ وجود
دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

آئی صدائے جبرئیل، تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات

(نظم "ذوق و شوق"۔ بالِ جبریل)

اس کے علاوہ علامہ محمد اقبال نے ایک اور جگہ بھی ''شام و فلسطین'' کے نام سے نظم لکھی ہے پھر ایک اور جگہ ضرب کلیم میں ''فلسطینی عرب سے'' کے عنوان بھی نظمیں شامل ہیں۔ مذکورہ نظموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رندانِ فرانسیس کا میخانہ سلامت
پُر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلت کا
ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا گر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملوکیتِ انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رُطب کا

(شام و فلسطین)

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

(فلسطینی عرب سے)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''فلسطین کے مختلف علاقوں کے خوبصورت مناظر ان کے ذہن میں تازہ ہوں گے۔ سر سبز و شاداب علاقہ، پھلوں اور پھولوں کے قطار اندر قطار درخت اور

پودے دور دور تک پھیلے ہوئے سبزیوں کے کھیت، انگور، انجیر اور مالٹوں کے باغات اور پھر موسم بہار کا۔" ۲۷

دوسرے اجلاس میں عہدیداران کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ مفتی سید امین الحسینی متفقہ رائے سے صدر کے عہدہ جلیلہ کے لیے منتخب ہوئے۔ ان کے علاوہ چار نائب صدور کو بھی منتخب کیا گیا جن میں حضرت علامہ محمد اقبال بھی شامل تھے۔ چار سیکرٹریوں کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا۔ مؤتمر کے اجلاس میں مختلف مسائل کے حل کے لیے کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ اس اجلاس کے آخر میں علامہ محمد اقبال نے ایک اور تقریر کی۔ تقریر کو سامعین نے خوب سراہا اور دوران تقریر بار بار نعرہ تکبیر کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔

۱۷ دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح اقبال اور مولانا غلام رسول مہر فلسطین سے بذریعہ اطالوی جہاز روانہ ہوئے۔ یہ جہاز ۲۸ دسمبر کو بمبئی پہنچا، دن کا سارا وقت ان کا خلافت ہاؤس میں صرف ہوا، شام کو بمبئی سے بذریعہ ریل براستہ دہلی لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح آٹھ بجے لاہور پہنچ گئے۔ جہاں ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اقبال کا کہنا ہے کہ "میرا یہ سفر زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے"

عطیہ فیضی نے دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر اقبال کے اعزاز میں "ایوان رفعت" کا اہتمام کیا۔ جس میں شرکت کے لیے علامہ محمد اقبال اپنے ایک دوست کے ہمراہ عطیہ فیضی کے مکان پر تشریف لے گئے۔

تیسری گول میز کانفرنس:

دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد حکومت برطانیہ نے تیسری گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا۔ یہ کانفرنس ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء سے ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء تک جاری رہی۔ علامہ محمد اقبال ۱۷ اکتوبر کو لاہور سے یورپ کے سفر کے لیے ایک بار پھر روانہ ہوئے۔ اس بار ان کے ہمراہ سید امجد علی بھی تھے۔ بمبئی سے کونٹے روسو نامی بحری جہاز سے وینس پہنچے اور وہاں سے بذریعہ ریل پیرس روانہ ہوئے۔ علامہ

کے قریبی دوستوں میں سے سردار امراؤ سنگھ مجیٹھیا شیر گل نے ریلوے اسٹیشن پر ان کا استقبال کیا اور انھیں ایک شاندار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ علامہ محمد اقبال کی اولین خواہش تھی کہ وہ نپولین کے مقبرے پر حاضری دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا امراؤ سنگھ اور سید امجد علی نے انہیں نپولین کے مقبرے لے جانے کا بندوبست کیا۔ علامہ محمد اقبال نپولین کے مداحین میں سے تھے۔ علامہ اقبال نے مقبرے پر حاضری دی اور ایک نظم "نپولین کے مزار پر" بھی لکھی جس میں اسے زبردست انداز میں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم بال جبریل میں شامل ہیں اس نظم کے چند اشعار حاضر ہیں:

راز ہے ، راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جو ش کردار سے شمشیر سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

جوشِ کردار سے تیمور کا سیل ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

صف جنگاہ میں مردان خدا کی تکبیر
جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

ہے مگر فرصت کردار نفس یادو نفس
عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

"عاقبت منزل ماوادی خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز ! "

("نپولین کے مزار پر"۔ بال جبریل)

وقت کی قلت کے باعث برگساں سے ملاقات کو موخر کردیا گیا۔ علامہ کا خیال تھا کہ لندن سے واپسی پر برگساں سے ملاقات کی جائے گی۔ لندن میں "نیشنل لیگ آف لندن" کی طرف سے علامہ اقبال کے لیے زبردست دعوت استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس تنظیم کی صدر مس مارگریٹ فرکوہرسن اقبال کے علم وفضل کی وجہ سے بہت متاثر تھیں۔ یہ اجلاس ۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو منعقد ہوا جس میں بیشتر ممبران برطانوی پارلیمنٹ کے علاوہ معززین شہر کی کثیر تعداد کو بھی مدعو کیا گیا تا کہ وہ حضرت علامہ اقبال کے خیالات سے مستفید ہوسکیں۔ تیسری گول میز کانفرنس کے احوال کے بارے میں ڈاکٹر صابر کلوروی لکھتے ہیں:

"تیسری گول میز کانفرنس میں زیادہ تر ہندوستان کے آئینی معاملات مثلاً رائے دہی، کمیٹیوں کا تقرر، ریاستوں کے امور پر تحقیقاتی کمیٹی کا قیام اور وفاقی مالیات کمیٹی کا تقرر۔ اس کانفرنس میں بھی ہندوؤں نے مسلمانوں سے عدم مفاہمت کی پالیسی جاری رکھی۔ چناں چہ اقبال نے بددل ہو کر کانفرنس کی کارروائی میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔" [۴۸]

علامہ محمد اقبال تیسری گول میز کانفرنس سے بہت مایوس اور رنجیدہ تھے وہ اکثر لیڈروں کی دوغلی پالیسی سے بہت نالاں تھے۔

برگساں سے ملاقات:

ایک ممتاز فرانسیسی فلاسفر اور دانش ور ہینری برگساں ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ برگساں تصور زماں کی وجہ سے عالمی سطح پر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ برگساں کی معروف کتابوں میں "Matter

Creative "،"Time and Free Will"،"Laughter"، "and Memory
The Two Sources of Morality and "،"Evolution
The Creative Mind: An Introduction to "،"Religion
The Meaning of the War: "،"Mind-Energy"،"Metaphysics
"Life & Matter in Conflict" شامل ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں "ادب کا نوبل پرائز" ملا۔ ہنیری برگساں ۱۹۴۱ء میں فوت ہوئے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۳۲ء کو تیسری گول میز کانفرنس کے اختتام پر حضرت علامہ محمد اقبال پیرس چلے گئے جہاں انھوں نے ہنیری برگساں سے ملاقات کی۔ علامہ اقبال اس کے تصورِ زماں سے متاثر تھے۔ کیوں کہ علامہ محمد اقبال اس تصور واقعیت زماں کو اسلامی تصور کے نہایت قریب سمجھتے تھے۔ ہنیری برگساں ان دنوں گھٹنوں میں شدید درد کی وجہ سے کہیں چل پھر نہیں سکتے تھے بل کہ ویل چیئر پر ایک ملازم کی مدد سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے۔ اس لیے لوگوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر چکے تھے۔ لیکن جب علامہ اقبال کے آنے کی اطلاع ملی تو برگساں نے ان کے لیے خصوصی وقت نکالا اور یہ ملاقات کوئی دو گھنٹے جاری رہی۔ علامہ محمد اقبال نے اِس امر کا اہتمام کیا کہ برگساں سے ہونے والی گفت گو کو نوٹ کر لیا۔ لہٰذا ایک صاحب اس گفت گو کو لکھتے رہے، مگر بعد میں وہ خود اپنا لکھا نہ پڑھ سکے۔ گفت گو کے اختتام پر جب ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے برگساں کو یہ حدیث سنائی "زمانے کو بُرا مت کہو کہ زمانہ خود خدا ہے" تو اس حدیث کے سنتے ہی برگساں حیران ہو کر اچھل پڑا اور اقبال سے پوچھنے لگا "کیا یہ واقعی حدیث ہے؟"

اقبال کا دورہ اسپین:

علامہ محمد اقبال کی شدید خواہش تھی کہ وہ اسپین کا دورہ کریں اور وہاں کے تاریخی مقامات کی

زیارت کریں۔ یہ خواہش پوری ہونے کا وقت آن پہنچا تھا۔ وہ پیرس سے برگساں سے ملنے کے بعد جرمنی بھی جانا چاہتے تھے انھوں نے ویگے ناسٹ کو ۱۲ دسمبر اور ۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء کو خط میں لکھا تھا کہ وہ ہائیڈل برگ آنا چاہتے ہیں مگر بعد میں علامہ اقبال نے ویگے ناسٹ کو ۲۱ جنوری کو مطلع کر دیا کہ اب ان کا ارادہ جرمنی آنے کا نہیں رہا۔

علامہ محمد اقبال کا یہ دورہ تین ہفتوں پر محیط تھا۔ اس عرصے میں انھوں نے ہسپانوی عالم پروفیسر میگول سن پلے چواکس کی زیرِ صدارت The Intellectual World of Islam and Spain کے موضوع پر میڈرڈ یونیورسٹی میں لیکچر بھی دیا۔ وہ اسپین کے پانچ شہروں کی سیر کر سکے جن میں میڈرڈ، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ شامل ہیں۔ وہ قرطبہ میں قیام پذیر ہوئے دیگر مقامات دیکھنے کے علاوہ انھوں نے مسجد قرطبہ کی زیارت بھی کی۔ وہ مسجد کی حالت دیکھ کر رنجیدہ بھی ہوئے اور ان پر رقت طاری ہوگئی، وہ اشک بار ہو گئے وہاں انھوں نے دو نفل بھی ادا کیے۔ سفر ہسپانیہ کے بارے میں شیخ محمد اکرام کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم ''مسجد قرطبہ'' بھی لکھی، الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔''۹ع

علامہ محمد اقبال کو ہسپانیہ کی سیاحت کا بھی خوب موقع ملا۔ ہسپانیہ مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا شاہ کار ہے مسلمانوں کی جاہ و حشمت اس علاقہ کے در و دیوار میں جھلکتی ہے۔ مسلمانوں نے جام شہادت نوش کرتے ہوئے اس خطہ کو مانندِ حرم بنا دیا تھا۔ اس کے صحرا اذان کی آواز سے لرز اٹھے۔ مسلمانوں کی آتش نوائی نے خرمنِ باطن کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ علامہ محمد اقبال نظم ''ہسپانیہ'' میں رقم طراز ہوتے ہیں:

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

کیوں کر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا، وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں

غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن
تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

دیکھا بھی دکھایا بھی، سنایا بھی سنا بھی
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں، نہ خبر میں

قرطبہ بہت قدیم شہر ہے جو کسی وقت مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہا، مسجد قرطبہ بھی انہی دنوں کی یادگار ہے۔اس شہر کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

"قرطبہ کی تاریخ کئی سال قبل مسیح پرانی ہے (قرطبہ سب سے پہلے ۱۷۱ء میں

مسلمانوں کے زیر تسلط آیا، عبدالرحمٰن اول نے قرطبہ کو اپنی سلطنت کا دارالخلافہ بنایا۔ دسویں صدی کے وسط میں عبدالرحمٰن الثالث کے دور میں اس کی شان و شوکت قابل دید تھی۔ پھر فرانسیسیوں کے حملے میں تباہ ہو گیا۔ جنرل فرانکو نے ۳۹۔۱۹۳۶ء کی خانہ جنگی میں شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس شہر میں مذکورہ جامع مسجد کا سنگ اندلس کے مشہور اموی فرماں روا عبدالرحمٰن الداخل کے ہاتھوں رکھا گیا۔'' ۵۰؎

عیسائی تسلط کے بعد اس مسجد کو گرجا کی صورت دے دی گئی تھی۔ محرابوں اور دیواروں پر لکھی ہوئی قرآنی آیات کو پلاسٹر سے چھپا دیا گیا تھا۔ یہ صورت حال کئی سو سال برقرار رہی۔ پھر بعد میں عیسائی راہبوں سے لے کر محکمہ آثار قدیمہ نے اپنے تصرف میں لیا تو دیواروں پر پلاسٹر اتار دیا گیا اور قرآنی آیات دوبارہ اسی آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہو گئیں جن کی شان و شوکت کو دیکھ کر اقبال نے ایک طویل نظم ''مسجد قرطبہ'' لکھی جو ان کی کتاب ''بال جبریل'' میں شامل ہے۔ اس نظم میں مسلمانوں کے عہد رفتہ کو یاد کیا گیا ہے اور مسجد قرطبہ کے بارے میں علامہ محمد اقبال کے تاثرات موجود ہیں۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اے حرمِ قرطبہ، عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود

عرشِ معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود

پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گداز سجود

کافر ہندی ہوں میں ، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود ، لب پہ صلوٰۃ و درود

علامہ محمد اقبال مسجد قرطبہ کی موجودہ حالت دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئے اور اس کی ویرانی ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مسلمانوں کی عہد رفتہ کی ایک یادگار کو دیکھ کر جو عیسائیوں کے قبضہ میں رہی انھوں نے اسے گرجا کی شکل دے دی تھی کئی سو سال اسی طرح گزر گئے بعد میں اس مسجد کو جب آثار قدیمہ نے اپنے تصرف میں لیا تو دیواروں پر قرآنی آیات پر لگی ہوئی پلاسٹر کو اتارا تو قرآنی آیات کے دلکش شاہ کار دوبارہ اسی شان و شوکت کے ساتھ دکھائی دینے لگے تھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''ایک موقع پر کسی نے علامہ سے پوچھا کہ ''مسجد کو دیکھ کر آپ پر کیا اثر ہوا تھا؟'' تو انھوں نے انگریزی میں جواب دیا:'' It is a Commentary on the Qur'an written in stones'' (یہ قرآن کی ایسی تفسیر ہے، جو پتھروں کے ذریعے لکھی گئی ہے) درحقیقت ''نظم کا موضوع جس قدر عظیم اور رفیع الشان ہے، اس کا فنی پیرایہ بھی اسی قدر حسین و جمیل ہے۔ ''مسجد قرطبہ'' کا تقدس، اس کی رفعت و پاکیزگی اور جلال و جمال، اقبال کی اس نظم کی صورت میں مجسم ہو کر ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ اسے پڑھ کر قاری کے دل و دماغ پر مسجد قرطبہ کی شوکت و سطوت کا ایک نقش قائم ہوتا ہے اور یہ نظم ایک ایسا معجزۂ فن معلوم ہوتی ہے، جس کی تکمیل اقبال نے اپنے خون جگر کے ذریعے کی ہے۔ یوں تو بال جبریل کی چھ نظمیں اقبال کے دورہ ہسپانیہ کی یادگار ہیں اور یہ

سب اردو کی بہترین نظموں میں شمار ہونے کے لائق ہیں مگر ان سب میں "مسجد قرطبہ" فکر و فن کا ایسا شاہکار ہے جس کی مثال دنیا جہان کی شاعری میں کم ہی ملے گی۔" ۵۱

علامہ محمد اقبال نے مسجد قرطبہ کی زیارت کے علاوہ قرطبہ شہر کے نواح میں مدینۃ الزہرا کے مٹتے ہوئے نشانات بھی دیکھے اور غرناطہ بھی گئے۔ کسی زمانہ میں یہ تمام علاقے مسلمانوں کے قبضہ میں رہے ہیں۔ اس وقت کی اہم یادگاریں آج بھی مسلمانوں کو ان کا ماضی یاد دلا رہی ہیں۔ علامہ اقبال ان تاریخی عمارات کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ ہسپانیہ کا دورہ علامہ اقبال کی زندگی کا ایک یادگار سفر ہے۔

۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء کو ہسپانیہ سے حسین یادیں لے کر اقبال پیرس کے لیے روانہ ہوئے۔ پیرس پہنچ کر وہ وہاں کافی دن مقیم رہے۔ پیرس کی ایک مسجد نے بھی اپنے مراکشی نقش و نگار سے علامہ محمد اقبال کو اپنی طرف مائل کیا۔ علامہ اقبال اس مسجد کی خوبصورتی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اقبال کو مسجد قرطبہ اور پھر پیرس کی اس مسجد کے بعد ان کی بازگشت اور حسن رعنائی ان کے حسن خیال کا حصہ رہی۔ انھوں نے دنیا کے خوب صورت شہر پیرس کے بارے میں بھی ایک نظم "پیرس کی مسجد" کہی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مری نگاہ کمال ہنر کو کیا دیکھے
کہ حق سے یہ حرم مغربی ہے بیگانہ

حرم نہیں ہے، فرنگی کرشمہ بازوں نے
تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بت خانہ

یہ بت کدہ انھی غارت گروں کی ہے تعمیر
دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ

اقبال کا دورہ کابل :

بچہ سقہ تخت کابل پر قابض رہا لیکن اسے بے دخل کر کے جنرل نادر خاں نے عنان اقتدار سنبھالا تو انھوں نے ستمبر ۱۹۳۳ء میں اقبال کو کابل آنے کی دعوت دی۔ اس دعوت پر علامہ اقبال بہت خوش تھے۔ انھوں نے فارسی زبان میں چند اشعار کہے جن میں انھوں نے کہا کہ اس دعوت نے میرے جسم و جاں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔

نادر افغاں شہ درویش خو
رحمت حق بر روان پاک او

کار ملت محکم از تدبیر او
حافظ دین مبیں شمشیر او
از حضور او مرا فرماں رسید
آنکہ جانِ تازہ در خاکم دمید

علامہ محمد اقبال اور راس مسعود ۲۰ راکتوبر ۱۹۳۳ء کی صبح لاہور سے روانہ ہوئے۔ ۲۲ راکتوبر کو وہ کابل پہنچ گئے دارالامان نامی شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ علامہ اقبال کے سیکرٹری کے طور پر غلام رسول خان بیرسٹر اور سر راس مسعود کے سیکرٹری کے طور پر پروفیسر ہادی حسن بھی کابل گئے۔ سید سلیمان ندوی چند روز تاخیر سے کابل پہنچے۔ شاہی محل ''قصر دل کشا'' نادر خاں سے اقبال کی ملاقات ہوئی اقبال نے اس ملاقات کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار ''مثنوی مسافر'' میں کچھ یوں بیان کیا ہے۔

خلق او اقلیم دلہا را کشود رسم و آئین ملوک آنجا نہ بود
پادشا ہے خوش کلام و سادہ پوش سخت کوش و نرم خوئے و گرم جوش

صدق و اخلاص از نگاہش آشکار   دین و دولت از وجودش استوار

گفت ازاں آتش کہ داری در بدن   من ترا دانم عزیز خویشتن

علامہ محمد اقبال نے کابل کے نواح میں ظہیر الدین بابر کا مقبرہ بھی دیکھا اور اس موقع پر انھوں نے کچھ اشعار بھی کہے جن میں کہا کہ تو بہت خوش قسمت ہے کہ تیرا جسد خاکی اس سرزمین میں آرام کر رہا ہے، جو فرنگیوں کی طلسم سے آزاد ہے۔

۲۹ راکتوبر کی سہ پہر علامہ اقبال، وزیر خارجہ سردار فیض احمد خاں کے ساتھ نادر شاہ سے ملاقات کے لیے قصر دل کشا گئے۔ نادر شاہ سے تنہائی میں ملاقات کا موقع ملا۔ کابل کی آخری شب ہندوستانی احباب الوداعی ملاقات کے لیے دارالامان تشریف لائے۔ کابل میں قیام کے دوران مختلف مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے سیکڑوں لوگوں نے علامہ اقبال سے ملاقات کی اور ایشیاء کے سب سے بڑے شاعر علامہ محمد اقبال کا دیدار کیا۔ ان کے لیے خوشی کا سماں تھا کہ اتنا بڑا فلسفی، شاعر، دانش ور اور حالات حاضرہ پر گہری سوچ اور فکر رکھنے والا دانا شخص علامہ محمد اقبال کی صورت کابل کی سرزمین کو فخر و انبساط بخشنے یہاں آیا ہوا ہے۔ کابل کی سرزمین کو یہ شرف حاصل ہوا ہے کہ اس پر ایک عاشق رسول ﷺ اور دین مبین سے والہانہ محبت رکھنے والے مرد درویش قدم رنجہ فرمایا۔ یقیناً وہ ذرے درخشاں آفتاب کی صورت اختیار کر گئے ہوں گے جن پر اقبال ایسے مفکر عظیم نے قدم رکھا ہوگا۔ علامہ محمد اقبال کابل کی سرزمین کی خوبصورتی اور یہاں سے ملنے والی محبت کو بھی کبھی نہیں بھولے۔ کابل نے اقبال کو بہت متاثر کیا اس کا تذکرہ ان کے سفرنامے ''مثنوی مسافر'' میں ان الفاظ میں ملتا ہے۔

شہر کابل ، خطہ جنت نظیر
آب حیواں از رگ تاکش بگیر
چشم صائب از سوادش سرمہ چیں
روشن و پائندہ باد آں سر زمیں

آں دیار خوش سواد آں پاک بوم
باد او خوش تر ز باد شام و روم

آب او براق و خاکش تابناک
زندہ از موج نسیمش مردہ خاک

ساکنانش سیر چشم و خوش گہر
مثلِ تیغ از جوہر خود بے خبر

ان فارسی اشعار کا ترجمہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے کچھ یوں کیا ہے:

"کابل کا شہر جنت نظیر ہے۔ اس کے انگوروں کے رس سے آب حیات حاصل کیجئے۔ صائب کی آنکھ نے اس شہر کے حسن سے روشنی حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ اس سرزمین کو روشن و پائندہ رکھے۔ شہر خوش منظر ہے۔ اس کی سرزمین پاکیزہ اور آب و ہوا روم و شام سے بہتر و خوش تر ہے۔ اس کا پانی شفاف اور خاک چمک دار ہے۔ اس کی موج نسیم سے مردہ زمین بھی زندہ ہو جاتی ہے۔ یہاں کے باشندے سیر چشم اور شریف النفس ہیں، لیکن تلوار کی طرح، اپنے (اندر پوشیدہ) جوہر سے بے خبر ہیں" ۵۲

علامہ محمد اقبال نے شہر غزنین، قندھار کی بھی سیر کی مختلف تاریخی عمارات بھی دیکھیں۔ جن کی یاد نے اقبال کو تادیر اپنے کلاوے میں جکڑے رکھا۔ اس حوالے سے عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

"کوئی تین ہفتے کے قیام کے بعد علامہ اقبال غزنی اور قندھار گئے۔ غزنی کے آثار میں سلطان محمود غزنوی، حکیم سنائی، اور حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ

کے والد محترم کے مزارات پر بطور خاص فاتحہ خوانی کی۔ پھر قندھار پہنچ کر خرقہ شریف کی زیارت کی۔ واپسی پر علامہ نے مثنوی "مسافر" میں اپنے سفرِ افغانستان کے جذبات واحساسات نظم کیے۔" 53

نادر شاہ نے اپنے مہمانوں کو قیمتی قالین تحفہ میں دیے۔ بذریعہ ریل یہ قافلہ پہلے کوئٹہ پہنچا جن میں علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی،، بیرسٹر غلام رسول اور علی بخش شامل تھے۔ سید سلیمان ندوی تو ملتان اتر گئے اور۔ اقبال، بیرسٹر غلام رسول اور علی بخش ۴ نومبر کی شب لاہور پہنچے۔ طویل سفر کی تکان سے علامہ بخار میں مبتلا ہو گئے۔ اسی ناسازیِ طبع کے دوران انھیں نادر شاہ کے قتل کی دکھ بھری خبر بھی سننا پڑی۔ علامہ اقبال کو ان کی وفات کا بہت گہرا دکھ ہوا۔ انھوں نے اپنے تعزیتی پیغام میں اس کا اظہار بھی کیا۔

۴ دسمبر ۱۹۳۳ء کو پنجاب یونی ورسٹی نے انھیں "ڈی لٹ" کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔ حضرت علامہ محمد اقبال ۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء کو گردوں میں درد کا مرض لاحق ہو گیا تھا جو طوالت اختیار کرتا چلا گیا۔ انہی دنوں ان کی بائیں آنکھ پر موتیا کی شکایت بھی سامنے آئی۔ داہنی آنکھ تو بچپن میں ہی بصارت سے محروم ہو چکی تھی۔ علامہ محمد اقبال جب دو سال کے تھے تو کسی بیماری کے سلسلے میں انھیں جونکیں لگائی گئی تھیں جس کے سبب ان کی داہنی آنکھ کی بصارت مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی۔ بائیں آنکھ سے ہی دنیا کو دیکھتے رہے۔ انھوں نے کبھی محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ ان کی ایک داہنی آنکھ کی روشنی جاتی رہی ہے۔

اس کے باوجود انھوں نے اپنی مصروفیات کو جاری وساری رکھا۔ دوستوں کے خطوط کے جوابات بھی لکھتے رہے اور دیگر ادبی سلسلے بھی جاری رکھے حالاں کہ ڈاکٹروں نے انھیں مطالعہ نہ کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ مگر علامہ کتابیں بھی پڑھتے رہے اور دوستوں سے مختلف کتابوں کے بارے میں پوچھتے بھی رہے۔ انھی تاریخوں کے کئی خطوط میں مختلف کتابوں، رسائل کا ذکر ملتا ہے۔

عبدالمجید سالک اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''اس زمانے میں علامہ اقبال اکثر علیل رہنے لگے تھے اور آنکھوں میں بھی موتیا اتر رہا تھا، لیکن اس کے باوجود ان کی علمی مصروفیتوں کا یہ عالم تھا کہ اس زمانے میں انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی اور دوسرے دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں، ان سب میں زمان و مکان کے متعلق مختلف کتابوں کا سراغ لگانے کی استدعا کی ہے۔ فلاں فلاں امام نے زمان پر کیا لکھا ہے۔ امام رازی کی ''مباحث شرقیہ'' کہاں ملے گی۔ ''اتفاق فی ماھیۃ الزمان''، ''تسویلات فلسفہ'' اور ''شرح مواقف'' دیکھ چکا ہوں۔ ''نور الاسلام'' کا عربی رسالہ بابت مکان رام پور کے کتب خانے میں مل جائے گا۔ ملا محب اللہ بہاری کی ''جوہر فرد'' اگر آپ کے پاس ہو تو عاریتاً بھیج دیجیے۔''۵۴

۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء کو علامہ محمد اقبال اپنے دوستوں چودھری محمد حسین، جاوید میاں اور علی بخش کے ہمراہ شاہی مسجد گئے۔ وہاں ننگے پاؤں ٹھنڈے فرش پر چلنے کے باعث انھیں سردی لگ گئی۔ گھر واپسی پر سویوں پر دہی ڈال کر کھانے سے زکام کی شکایت بھی ہوگئی۔ اس کے نتیجہ میں علامہ کا گلا بیٹھ گیا۔ ان بیماریوں کے ساتھ ساتھ انھیں اختلاج قلب، ضعف قلب، پھیپھڑوں کے عوارض، ہلکا دمہ، قبض، درد دنداں، درد گردہ اور سوءِ ہضم کی شکایات بھی لاحق ہوتی گئیں۔

گلا بیٹھ جانے سے ان کی آواز دب گئی انھیں بولنے میں سخت تکلیف تھی۔ ان دنوں علامہ اقبال سخت پریشانی کے عالم میں رہتے۔ علامہ کی نفسیات بھی مجروح ہوئیں اور غم زدہ نظر آتے۔ وہ حکیم نابینا سے علاج کروانے میں راحت محسوس کرتے۔ حکیم نابینا ان کے مزاج اور طبیعت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''آواز بیٹھ جانے سے وہ اپنی خواہش کے مطابق تلاوت بھی نہ کر سکتے تھے اور اس کا انھیں بڑا قلق تھا۔ وہ ایلوپیتھک دواؤں پر یونانی دواؤں کو ترجیح دیتے

تھے۔ چناں چہ سید نذیر نیازی کی معرفت دہلی کے حکیم نابینا صاحب سے رجوع کیا گیا اور جون ۱۹۳۴ء کے دوسرے ہفتے ان سے دوا لینے کے لیے اقبال کو دہلی جانا پڑا۔ گلے کی خرابی کے ساتھ کبھی کبھی نقرس اور درد گردہ کی شکایت بھی ہو جاتی تھی۔ ایک تجویز یہ تھی کہ یورپ جا کر علاج کرایا جائے مگر اس کے لیے بھی وہ حکیم نابینا صاحب سے مشورہ ضروری سمجھتے تھے۔" ۵۵

۲۹ جون کو جاوید اقبال، چودھری محمد حسین، منشی طاہر الدین اور علی بخش کے ہمراہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے مزار کی زیارت کے لیے سرہند کے لیے روانہ ہوئے۔ علامہ محمد اقبال کے دوست غلام بیک نیرنگ بھی انبالہ سے سرہند آئے۔ علامہ نے وہاں مزار کی زیارت کی اور تلاوت قرآن پاک بھی کی۔

یکم جولائی ۱۹۳۴ء کو انجمن حمایت اسلام نے انھیں اپنا صدر منتخب کیا۔ آپ اس عہدے پر ۱۹۳۷ء تک فائز رہے۔ ۱۹۳۴ء میں ہی ان کی فارسی زبان میں "مثنوی مسافر" شائع ہوئی۔ ۱۴ جولائی کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے اجلاس کی صدارت فرمائی جب کہ صدارتی خطبہ گلے کی خرابی کے باعث سیکرٹری نے پڑھ کر سنایا۔ علامہ محمد اقبال اپنی ناسازی طبع کے باعث بیرون ملک یا دیگر شہروں میں جانے سے گریز کرتے رہے۔ صرف ایک دو بار دوا کی خاطر دہلی گئے۔ یا پھر ۲۳ دسمبر ۱۹۳۴ء کو علی گڑھ تشریف لے گئے جہاں انھیں ایک خصوصی کانووکیشن میں "ڈی لٹ" کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا گیا۔ نومبر ۱۹۳۴ء میں انھیں آکسفورڈ یونی ورسٹی کی طرف سے رہوڈز لیکچروں کی دعوت ملی تھی۔ یہ ایک بڑا علمی اعزاز تھا۔ اس کا موضوع " زمان ومکاں فلسفہ اسلام کی روشنی میں" تھا۔ علامہ اقبال کا خیال تھا کہ وہ اگلے برس تک ان امراض سے چھٹکارا پا لیں گے۔ خاص طور پر گلے کے مسئلہ کے لیے حکیم نابینا سے رابطے میں رہے۔ ان کی انہی پریشانیوں میں ایک اور بڑی پریشانی کا اضافہ سردار بیگم کی بیماریوں سے ہوا۔ سردار بیگم کا جگر اور تلی دونوں بڑھ گئے تھے۔ ڈاکٹروں کے علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو انھوں نے ان کا علاج بھی حکیم

نابینا سے کروانا شروع کر دیا۔ سردار بیگم کے اصرار پر علامہ نے اپنا ذاتی مکان جاوید منزل کے لیے میوروڈ پر قطعہ ارضی خریدی اور اس کی تعمیر کے لیے شیخ عطا محمد کی زیر نگرانی کام شروع ہوا۔ علامہ محمد اقبال کو اپنے علاج کے سلسلہ میں ۲۹ جنوری ۱۹۳۵ء بھوپال جانا پڑا۔ ۱۰ مارچ کو واپس لاہور پہنچے انھیں علاج کی غرض سے دوسری بار جولائی اور تیسری مرتبہ مارچ ۱۹۳۵ء میں بھوپال جانا پڑا۔

اپریل ۱۹۳۵ کو جاوید منزل کی تعمیر مکمل ہوئی تو ۲۰ مئی کو یہ گھرانہ وہاں منتقل ہوا۔ سردار بیگم کو چارپائی پر کمرے میں لایا گیا۔ جاوید منزل میں پہنچنے کے تیسرے روز سردار بیگم ۲۳ مئی کو شام چھ بجے رحلت فرما گئیں۔

بیرون ملک کے اسفار اور بیماریوں کی وجہ سے پیشہ وارانہ وکالتی مصروفیات خاصی تعطل کا شکار رہیں۔ بس ذریعہ معاش صرف کتابوں کی رائلٹی یا پھر یونیورسٹیوں کے پرچے دیکھنے پر رہ گیا تھا۔ اس کسم پرسی کی حالت میں راس مسعود نے نواب بھوپال سے علامہ اقبال کے لیے تاحیات پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کروا دیا۔ راس مسعود نے اسی طرح کے وظائف کے لیے ریاست بہاول پور اور ریاست حیدر آباد کو بھی کہا۔ مگر اقبال نے راس مسعود کو ایسا کرنے سے منع فرمایا اور کہا کہ میری ضروریات ان پانچ سو میں پوری ہو جاتی ہیں لہٰذا مزید پیسوں کی ضرورت نہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رفیع ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''آغا خان نے تو پانچ سو روپے ماہوار کی اعانت منظور کر لی تھی مگر اقبال نے ان کی تجویز کو پسند نہیں کیا۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۵ء کو راس مسعود کو ایک خط میں لکھا ''آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لیے کافی ہے اور کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے، جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔'' ۵۶

قادیانیت کے خلاف :

علامہ محمد اقبال ایک سچے اور کھرے عاشق رسول ﷺ تھے۔ انھوں نے قادیانیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا وہ جان چکے تھے کہ وہ نبی معظم ﷺ کے خلاف دلوں میں کیا زہر رکھتے ہیں۔ انہی دنوں انھوں نے الیاس برنی کی کتاب ''قادیانی مذہب'' کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے ہر فورم پر قادیانیوں کے خلاف آواز حق بلند کی۔ علامہ محمد اقبال نے قادیانیت کی تردید میں Qadianism & Orthodox Muslims کے عنوان سے ایک مربوط مضمون لکھا جس میں واضح طور پر کہا گیا کہ حکومت قادیانیوں کو مسلمانوں سے ایک الگ فرقہ قرار دیتے ہوئے ایک اقلیت قرار دے۔ یہ وہ پہلی آواز تھی جو قادیانیوں کے خلاف اٹھی۔ ان کا یہ مضمون دیگر اخبارات میں بھی چھپا۔

جنوری ۱۹۳۶ء میں ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے ایک اور مضمون لکھا۔ علامہ محمد اقبال نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے سلسلہ میں بھرپور جدوجہد کی۔ اس مضمون میں بھی انھوں نے حکومت وقت کو بتایا کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ فرقہ قرار دیا جائے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''قادیانیت کی بحثوں میں علامہ اقبال نے یہ سوال اٹھایا کہ قادیانیوں نے معاشرتی طور پر خود کو مسلمانوں سے الگ کر لیا ہے اور وہ مسلمانوں کو کافر سمجھتے اور کہتے ہیں تو پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے پر کیوں مُصر ہیں۔؟ علامہ اقبال کے بیانات اور مضمون کے ردعمل میں قادیانی حلقوں نے طرح طرح کے اعتراضات اٹھائے لیکن مسلم پریس نے اقبال کے مؤقف کی تائید کی اور قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کے لیے مزید

دلائل مہیا کیے۔" ۵۷

مولانا ظفر علی خاں اور مجلس احرار نے بھی احمدیت کے خلاف بھرپور تحریک کا آغاز کر دیا تھا "زمیندار" نے بھی احمدیت کے خلاف بھرپور کردار ادا کیا۔ "سن رائز" اور لائٹ" میں احمدیوں کے حق میں چھپنے والے بیانات کے جوابات بھی لکھتے رہتے ہیں ان کے جوابات اکثر "سٹیٹسمین" چھپتے رہے۔ جواہر لال نہرو نے بھی "ماڈرن ریویو" (کلکتہ) میں تین مضامین "مسلمان اور احمدیت" لکھے ان کے جوابات بھی بڑے مدلل اور ٹھوس بنیادوں پر علامہ اقبال نے دیے۔ ان کے کچھ ایسے نکات پیش کیے جن کا جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا۔ علامہ اقبال نے سخت اشتعال اور غصہ کی حالت میں بھی اپنے مضامین میں جماعت احمدیہ اور احمدیوں کے خلاف کبھی کوئی لفظ ایسا نہ لکھا کہ ان کی دل آزاری ہوتی ہو۔ بل کہ انھوں نے نہایت سنجیدہ اور عالمانہ انداز اختیار کیا تھا۔

پانی پت روانگی :

۲۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو علامہ پانی پت روانہ ہوئے چودھری محمد حسین، راجا حسن اختر اور جاوید اقبال بھی ان کے ہمراہ تھے، یہ سفر مولانا حالی کے صد سالہ جشن ولادت کی تقریبات میں شرکت کے سلسلے میں تھا۔ ۲۶ اکتوبر کو وہاں نواب بھوپال کی زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا۔ علامہ چند اشعار پیش نہ کر سکے بل کہ ان کے لکھے ہوئے اشعار کسی اور نے پڑھ کر سنائے۔

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می دانم
چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم

حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو
ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم

طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بہ جاں ھا افگند شورے کہ من دانم

بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہ سازیم
تو بر خاکش گہر افشان و من برگ گل افشانم

۱۹۳۵ء میں علامہ اقبال کا شعری مجموعہ "بال جبریل" زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔

۳۱/اکتوبر ۱۹۳۵ء کو علامہ محمد اقبال نے وصیت تحریر کی۔ جس میں لکھا تھا "منکہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا لاہور کا ہوں۔ اس وقت بہ قائمی ہوش وحواس خمسہ خود اقرار کرتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ چوں کہ میری ہر دو اولاد نابالغان ہیں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور من مقر کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی، اس لیے میں وصیت کرتا ہوں کہ میری وفات کے بعد اگر میری اولاد مذکورہ نابالغ رہی تو ان کی جائیدادوذات کے ولی مندرجہ ذیل ہوں گے۔

(۱) خواجہ عبدالغنی ولی ماموں حقیقی نابالغاں

(۲) شیخ اعجاز احمد، سب جج، برادرزادہ من مقر

(۳) چودھری محمد حسین، ایم اے، سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ لاہور۔

(۴) منشی طاہرالدین، جو کئی سال سے میرے کلرک رہے ہیں اور ان کی شرافت و دیانت پر مجھے پورا اعتماد ہے۔

اس وصیت کی رو سے میں ان جملہ حضرات کو نابالغان کی ذات کا ولی مقرر کرتا ہوں۔ تمام امور متعلقہ ذات و جائیداد نابالغان کا انتظام اولیاء مذکورہ کثرت رائے سے کیا کریں گے لیکن جب میرا پسر جاوید اقبال بالغ ہو جائے تو وہ اپنی ہمشیرہ منیرہ کی ذات و جائیداد کا ولی ہوگا اور اس کی جائیدادوذات کے متعلقہ انتظام خود بطور ولی کرے گا۔ ان اولیاء مقرر کردہ میں سے کوئی دستبردار ہو جائے یا فوت ہو جائے

یا کسی دیگر وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہ جائے تو اس صورت میں باقی اولیاء کا اختیار ہوگا کہ کثرت رائے سے اس کا جانشین مقرر کر لیں اگر کسی معاملے میں اولیائے مذکورہ کی رائے مساوی نہ ہو تو صدر انجمن حمایت اسلام لاہور کی رائے جس فریق کے ساتھ ہو اسی پر عمل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ اس وقت جو ملکیت کی چیزیں ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔ کتب فلسفہ ولٹریچر وغیرہ۔ ان میں سے چند کتب یعنی اپنی تصنیف کردہ کتب کے مطبوعہ نسخے مع مسودات، مثنوی مولانا روم، فارسی وانگریزی مرتبہ ڈاکٹر نکلسن، دیوان میرزا عبدالقادر بیدل قلمی، مثنوی مراۃ معنوی (مولانا روم مطبوعہ حیدرآباد) اپنے پڑھنے کا قرآن شریف اور باقی مسودات و کاغذات میں نے جاوید اقبال کو بطور یادگار دے دیے ہیں باقی کتب مطبوعہ انگریزی وغیرہ میری وفات کے بعد اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری میں رکھ دی جائیں۔ باقی میرا اسباب مثلاً دو قالین برنگ سرخ وردی وصوفہ و کرسیاں و بکس اور پہننے کے کپڑے غرباء میں تقسیم کر دیے جائیں۔

محمد اقبال بیرسٹرایٹ لاء بقلم خود

○

آخری برسوں کی مصروفیات:

بغرض علاج وہ ۳۰ جنوری کو علی الصبح دہلی پہنچے۔ اسی شام کو جامعہ ملیہ میں ترکی کی معروف صحافی خالدہ ادیب خانم کے ایک لیکچر کی صدارت کی۔ ان سے مختصر تبادلۂ خیال بھی رہا۔ اسی شب وہ دہلی سے روانہ ہو کر اگلی صبح بھوپال پہنچ گئے۔ جہاں وہ علاج کرواتے رہے۔ آخری برسوں میں علامہ محمد اقبال کو لاہور سے بذریعہ ریل کئی بار دہلی اور پھر دہلی سے بھوپال جانا پڑا۔

بیماریوں کے باوجود وہ ملکی سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے اور مسلمانوں کی حالت زار پر پریشان بھی رہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء میں قائداعظم محمد علی جناح کو پہلا خط لکھا، جس

میں انھوں نے ہندوستان کی سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی۔انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ ہندوستان کے مسلمان کے حالات سے بھی آگاہ کیا۔اپریل ۱۹۳۶ء میں ہی علامہ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں آخری بار شریک ہو کر نظم "نغمہ سرمدی" پیش کی۔اپریل ۱۹۳۶ء کو پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔قائداعظم نے لاہور پہنچ کر آپ سے ملاقات کی۔اسی برس ان کا اردو شعری مجموعہ "ضرب کلیم" اشاعت پذیر ہوئی۔فارسی کتاب "پس چہ باید کرد" شائع ہوئی۔

علامہ محمد اقبال ۱۹۳۷ء میں علالت کے باعث انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔۱۹۳۷ء کو الٰہ آباد یونی ورسٹی نے ڈاکٹر آف لاء کی اعزازی ڈگری دی۔علامہ اقبال کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا ان دنوں آپ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال اخبار پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔جنوری ۱۹۳۸ء آل انڈیا ریڈیو کی درخواست پر قوم کے نام پیغام، یہ آپ کی آخری تقریر تھی۔۲۰ اپریل کو علامہ کے پرانے دوست بیرن فان فلیٹ ملنے کے لیے تشریف لائے۔(میونخ یونی ورسٹی جرمنی میں علامہ کے ساتھ پڑھتے رہے تھے)۔مارچ آخری سیاسی بیان۔جس میں جمعیت العلمائے ہند کے صدر مولانا حسین احمد مدنی کے نظریہ قومیت کا جواب دیا اور بتایا کہ قومیں دین کی بنیاد پر بنتی ہیں نہ کہ وطن کی بنیاد پر۔

سردار بیگم کی وفات کے بعد جاوید منزل کے مکینوں کی زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا ہو چکا تھا۔ سردار بیگم کی خواہش تو پوری ہو گئی کہ اپنا مکان ہو۔اپنا مکان بن گیا۔سارے مکین سوگوار تھے۔ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں: "سردار بیگم کی بے وقت موت نے اقبال کو پژمردہ سا کر دیا تھا" سردار بیگم کی قبر پر کندہ ان کا یہ شعر ان کی دلی کیفیات کا مظہر ہے۔

راہی سوئے فردوس ہوئی مادر جاوید
لالے کا خیاباں ہے مرا سینہ پُر داغ

مسز ڈورس احمد کو بچوں کی نگہداشت اور تربیت کے لیے مقرر کیا گیا۔مسز ڈورس ایک جرمن خاتون تھیں۔پروفیسر رشید احمد صدیقی کی وساطت سے یہ خاتون لاہور آنے کے لیے راضی ہوئیں۔

مسز ڈورس کے بہنوئی ڈاکٹر اصغر علی حیدر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مسز ڈورس نے جاوید منزل پہنچ کر گھر کا نظم و نسق سنبھالا۔

مسز ڈورس سلیقہ مند اور سگھڑ خاتون تھیں۔ جاوید اقبال گیارہ برس اور منیرہ پانچ برس کی تھیں ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی دیکھ بھال کرتیں۔ بچے بھی ان کی نگرانی اور توجہ سے پر سکون ہو گئے تھے۔ انہیں راحت محسوس ہونے لگی تھی۔ ان دنوں علامہ اقبال رات کا کھانا ترک کر چکے تھے ان کے اصرار پر رات کو سوپ پینے لگے۔ مسز ڈورس احمد کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> "ڈورس احمد کو جلد اندازہ ہو گیا کہ سر محمد اقبال، ایک اہم شخصیت ہیں۔ وہ اردو کے معروف و مقبول شاعر بھی ہیں اور ہندوستانی سیاسیات میں ایک نمایاں حیثیت رکھنے والے راہ نما بھی .... مسز ڈورس جاوید منزل میں رہتے ہوئے سوچتی ہوں گی کہ علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی نے مجھے اس ملازمت پر آمادہ کرنے کے لیے جب کہا تھا کہ ہندوستان میں علامہ اقبال کو وہی مقام حاصل ہے جو جرمنی میں گوئٹے کو ہے۔ تو کچھ غلط نہ تھا، بعد ازاں ایک موقع پر مسز ڈورس نے رشید احمد صدیقی کے سامنے اعتراف کیا میں نے اپنی زندگی میں ایسا مخلص اور شریف آدمی نہیں دیکھا" ۵۸؎

علامہ محمد اقبال نیم دراز بستر پر لیٹے کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہتے۔ ان دنوں بھی ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ دمہ کی وجہ سے انہیں سانس لینے میں خاصی دشواری ہوتی۔ کھانسی کا دورہ پڑتا تو نیم بے ہوش ہو جاتے مگر پھر بھی حقے کا ساتھ نہ چھوڑتے۔ علامہ کی ایک آنکھ تو بچپن سے ہی بصارت سے محروم ہو چکی تھی، دوسری آنکھ میں موتیا اتر آیا تھا۔ ڈاکٹروں نے مطالعہ نہ کرنے کا مشورہ دے دیا تھا۔ ان دنوں جاوید اقبال اردو اخبار پڑھ کر سناتے جب کہ انگریزی اخبار مسز ڈورس احمد پڑھ کر سناتیں۔ اشعار اکثر نذیر احمد نیازی قلم بند کرتے۔ علامہ کی آنکھ کا آپریشن مارچ میں ہونا تھا

گردے کی سخت شکایت کے باعث آپریشن ستمبر تک ملتوی کر دیا گیا تھا۔ علامہ اقبال کے دوست خواجہ عبدالوحید اکثر تیمارداری کے لیے جاوید منزل آتے۔ علامہ اقبال کو اذیت ناک صورت حال میں دیکھ کر انہیں دکھ ہوتا ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ اقبال کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

"اپریل ۱۹۳۸ء کی ایک شام خواجہ عبدالوحید جاوید منزل پہنچے تو باتیں ہونے لگیں لکھتے ہیں: "میں زیادہ گفت گو نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ حضرت علامہ گفت گو کرنے کی طرف راغب ہیں۔ آپ تمدنِ اسلام اور بعض دوسرے موضوعات کے بارے میں گفت گو فرماتے رہے۔ لہجے میں بڑا جوش تھا اس وقت آپ کو شدید درد تھا۔ درد کی شدت سے آپ بستر پر الٹے لیٹ جاتے اور پھر گفت گو کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ میں دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا کہ کیوں اندر آیا۔ میں حاضر ہوتا، نہ آپ کو زحمت گفت گو ہوتی۔" ۵۹

اپریل میں علامہ کی حالت زیادہ بگڑ گئی، ان کے پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا، اس سے خون میں آکسیجن کم ہو گئی۔ اپریل میں دمے کے حملے زیادہ ہونے لگے اور بلغم میں خون آنے لگا۔ اقبال زندگی سے سخت مایوس ہو چکے تھے۔

۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کی شب معالجین جاوید منزل میں اکٹھے ہو گئے۔ معالجین نے یہ علامت دیکھی تو سخت مایوسی کا اظہار کیا۔ آپس میں ہونے والی سرگوشیاں بڑی معنی خیز تھیں، اقبال اس ساری صورت حال سے آگاہ ہو چکے تھے۔ وہ جانتے تھے۔ اب آخری لمحات آن پہنچے ہیں۔ رات بارہ بجے تک احباب وہیں رہے پھر ایک اک کر کے جانے لگے۔ ایک بجے تک تمام احباب جا چکے تھے۔ راجہ حسن اختر، ڈاکٹر عبدالقیوم وہیں رہے۔ علامہ اقبال پہلے پورچ میں لیٹے رہے پھر خنکی بڑھنے پر کمرے میں آ گئے علی بخش بھی ان کے ہمراہ کمرے میں موجود رہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم برآمدے میں آ کر لیٹ

گئے علی بخش علامہ کے شانے دبانے لگ گئے۔ ۲۱ راپریل بروز جمعرات ۱۹۳۸ء کو صبح پانچ بج کر چودہ منٹ پر علامہ اقبال اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اس وقت کئی مساجد میں صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ علی بخش نے اچانک گھبرا کر ڈاکٹر عبدالقیوم کو آواز دی ڈاکٹر عبدالقیوم اندر آئے نبض چیک کی اور ان کے منہ سے نکلا انا للہ وانا الیہ راجعون.....................

ڈاکٹر عبدالقیوم نے چادر سے ان کے چہرے کو ڈھانپ دیا۔ علی بخش بے اختیار رونے لگا۔ اتنے میں راجہ حسن اختر بھی واپس آ گئے عبدالقیوم نے فون پر ریڈیو پاکستان والوں کو علامہ کے انتقال کی اطلاع کی۔ ریڈیو پر خبر کیا نشر ہوئی پورا لاہور اقبال کا آخری دیدار کرنے اُمڈ آیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صابر کلوروی لکھتے ہیں:

> ''علامہ کی وفات سے لاہور میں کہرام مچ گیا، جگہ جگہ ماتمی جلوس جمع ہونے لگے، حکومت پنجاب نے لاہور میں عام تعطیل کا اعلان کر دیا۔ تمام نجی اور سرکاری ادارے بند ہو گئے۔ خلیفہ شجاع الدین، میاں نظام الدین، میاں امیر الدین اور غلام رسول مہر نے حکومت پنجاب سے درخواست کی کہ وہ اقبال کو شاہی مسجد کے باہر دفنانے کی اجازت دے۔ سر سکندر حیات شروع شروع میں اس سے متفق نہیں تھے۔ ادھر علامہ اقبال کی تدفین کے لیے اسلامیہ کالج کے میدان پر نظریں مرکوز تھیں اور ادھر چودھری محمد حسین اور ان کے مذکورہ بالا احباب اپنے فیصلے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ بالآخر ان تمام مشکلات پر قابو پالیا گیا اور حکومت پنجاب کو مسلمانوں کے اس متفقہ فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔'' ۶۰

علامہ محمد اقبال نے اپنی زندگی میں آرزو کی تھی کہ

کو کم را دیدہ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش

(رموزِ بے خودی)

رب العزت نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس مرد درویش کو بادشاہی مسجد کی مشرقی دیوار کو شرف عطا کیا کہ اس کے زیر سایہ سوئی ہوئی قوم کا درد اپنے سینے میں محسوس کرنے والا مرد مومن ابدی نیند سو گیا۔ جنازے میں ہجوم کی زیادتی سے کندھا دینا ممکن نہ تھا اس لیے چار پائی سے لمبے لمبے بانس لگا دیے گئے تا کہ لوگ کندھا دے سکیں۔

"جنازہ پانچ بجے علامہ اقبال روڈ سے اٹھایا گیا۔ جنازہ اٹھانے سے پہلے گورنر پنجاب کے خصوصی نمائندے اور نواب آف بہاول پور کی طرف سے ریاست کے ایک اعلیٰ رکن مسٹر کرامت اللہ نے پھولوں کی چادریں چڑھائیں۔ جنازے کو کندھا دینے کے سلسلے میں متوقع دھکم پیل کے پیش نظر چار پائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس لگا دیے گئے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سعادت سے بہرہ مند ہو سکیں۔ جنازے کے آگے مسلم لیگ کا ہلالی پرچم تھا، اور سوگوار بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے چل رہے تھے۔ ہجوم اس قدر زیادہ تھا، کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ہر شخص غم زدہ و افسردہ دکھائی دیتا تھا۔ جنازے کے ساتھ ہزار سکھ اور ہندو بھی شریک تھے جنازہ ریلوے روڈ سے گزر کر اسلامیہ کالج پہنچنا تھا جہاں نماز جنازہ ادا کی جانی تھی۔" (۱)

پہلی نماز جنازہ اسلامیہ کالج کے وسیع سبزہ زار میں پڑھائی گئی، دوسری نماز جنازہ بادشاہی مسجد میں رات آٹھ بجے ادا کی گئی۔ علامہ اقبال کے جسد خاکی کو بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے پہلو میں رات پونے دس بجے سپرد خاک کیا گیا۔

علامہ اقبال کا جنازہ برانڈرتھ روڈ اور دہلی دروازے کے راستے سات بجے شام بادشاہی مسجد پہنچا۔ علامہ اقبال کی نماز جنازہ مولانا غلام مرشد نے پڑھائی۔ علامہ اقبال کی نماز جنازہ رات آٹھ بجے ادا کی گئی۔ گورنر ہنری ڈی کریک نے مزار اقبال کی جگہ کے لیے محکمہ آثار قدیمہ سے اجازت لے

کردی۔ علامہ کا شعری مجموعہ ''ارمغان حجاز'' بعد از وفات شائع ہوا۔ علامہ اقبال کے مزار کی تعمیر کے لیے ۱۹۳۸ء میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں۔ چودھری محمد حسین، میاں امیر الدین، آغا شورش کاشمیری، حمید نظامی، راجہ حسن اختر اور خواجہ عبدالرحیم شامل تھے۔

مشہور تعمیراتی ادارہ میسرز چودھری محمد بخش فتح محمد لاہور کو مزار اقبال کی تعمیر کا ٹھیکہ دیا گیا۔ مزار اقبال کی تعمیر کا کام ۱۹۴۶ء میں شروع ہوا اور ۱۹۵۰ء میں کام مکمل ہوا۔ مزار میں لگانے کے لیے سرخ پتھر بیرونی ریاست دھولپور ہندوستان سے منگوایا گیا۔ جب کہ مزار پر سنگ مرمر مکرانہ ریاست جودھپور ہندوستان سے منگوایا گیا۔ ہندوستان کے علاقے آگرہ، دہلی اور مکرانہ کے کاریگروں نے پتھروں کی تراش کا کام نہایت خوبصورتی سے انجام دیا۔ مزار اقبال میں نصب شدہ دروازے ساگوان کی لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔ افغانستان کی حکومت نے مزار اقبال کے لیے جو چیزیں فراہم کیں ان کی قیمت اس وقت تین لاکھ روپے بنتی تھی۔ مزار اقبال میں علامہ اقبال کی قبر کے سرہانہ پر لوح مزار کی اونچائی چار فٹ ہے۔ اور یہ سنگ لاجورد ہے جس پر عبارت کندہ ہے۔ محکمہ اوقاف نے مزار اقبال کے لیے جو قالین خریدا وہ ۱۳۱۹۳ روپے کا تھا۔ مزار اقبال پر نصب فانوس جو چھت کے وسط میں آویزاں کیا گیا ہے وہ اس وقت ۹۰۰ روپے میں خریدا گیا۔ محکمہ آثار قدیمہ نے ۱۳ جون ۱۹۴۹ء میں مزار اپنی تحویل میں لیا۔

فروری ۱۹۵۰ء میں مزار کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ نواب زین یار جنگ نے مزار کا ڈیزائن بنایا اور بشیر احمد انجینئر کی نگرانی میں کام مکمل ہوا۔ بشیر احمد نے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کی تھیں۔ مزار کی تعمیر میں تاخیر کی کئی وجوہات تھیں، ان میں دو یہ بھی تھیں کہ اس وقت کے وزیر تعمیرات حکومت پنجاب سردار سندر سنگھ اجازت کے لیے رضامند نہ تھے، دوسرا مطلوبہ رقم کی عدم دستیابی تھی۔ کئی مخیر حضرات خطیر رقم دینے کو بھی تیار تھے مگر ان کی ایک شرط تھی کہ کتبہ میں ان کا نام درج کیا جائے۔ مزار کمیٹی کو یہ پسند نہ تھا حکومت پنجاب نے بھی اس سلسلہ میں اخراجات کی پیش کش کی مگر چودھری محمد حسین نے مزار کے لیے

چندہ قوم سے لینے کو ترجیح دی۔

میاں امین الدین لوکل سیلف گورنمنٹ کے سیکرٹری بنے تو ان کی ذاتی دلچسپی اور کوششوں سے مزار کی تعمیر کے کام کا آغاز ہوا۔ اس مزار کی مزید تعمیر کے حوالے سے ڈاکٹر صابر کلوروی لکھتے ہیں:

> ''قیام پاکستان کے بعد غلام محمد وزیر مالیات نے حکومت پاکستان کی طرف سے مزار کی تعمیر کے لیے کچھ رقم کی پیش کش کی لیکن مزار کمیٹی نے اسے قبول نہ کیا اور یوں مزار کی تعمیر پر اٹھنے والے تمام اخراجات علامہ اقبال کے عقیدت مندوں نے خود پورے کیے۔ افغانستان کے سفیر اور علامہ اقبال کے دیرینہ دوست سردار صلاح الدین سلجوقی کے طفیل حکومت افغانستان نے مزار کی لوح اور تعویذ بھیجا۔ قدموں کی جانب دو مشعلیں بھی تھیں جو راستے میں ٹوٹ گئیں چناں چہ یہ جگہ اب تک خالی ہے۔ یہ تعویذ او رکتبہ دنیا کے سب سے قیمتی پتھر (Lapislazuli) سے بنایا گیا ہے۔ اس پتھر کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ اس قدر شفاف ہے کہ دوسری طرف کی روشنی بھی اس میں نظر آتی ہے۔ آج کل اس پتھر کی قیمت دس بارہ لاکھ روپے سے کم نہیں۔'' ۶۴

مزار کے بیرونی حصے کا سرخ سنگ مرمر اور اندرونی حصے والی سنگ مرمر کی سلیں راجپوتانہ سے منگوائی گئیں۔ مزار کی تعمیر پر ایک لاکھ روپے صرف ہوئے۔ اور یہ مزار ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء میں مکمل ہوا۔

مزار کی چھت پر علامہ اقبال کی فارسی غزل کے چھے اشعار درج ہیں۔

دم مرا صفت باد فرودیں کردند
گیاہ راز سر شکم چو یاسمیں کردند

نمود لالہ صحرا نشیں ز خونابم
چناں کہ بادۂ لعلے بساتگیں کردند

بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں
ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند

فروغ آدم خاکی ز تازہ کاری ہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

چراغ خویش بر افروختم کہ دست کلیم
دریں زمانہ نہاں زیر آستیں کردند

در آبجدہ و یاری زخسرواں مطلب
کہ روز فقر نیاگاں ماچنیں کردند

مزار کے باہر شمالی دیوار جو بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کی جانب ہے ایک تختی نصب ہے جس پر یہ اشعار درج ہیں۔

بیا تا کار ایں امت بسازیم
قمار زندگی مردانہ بازیم

چناں نالیم اندر مسجد شہر
کہ دل در سینہ ملا گدازیم

(بال جبریل)

پہلے مزار اقبال کے اندر اور باہر کوئی اردو شعر کندہ نہیں تھا مگر اب مزار کے باہر ایک تختی پر ان کا ایک مشہور شعر لکھ کر لگا دیا گیا ہے۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

حوالہ جات

۱ ڈاکٹر صابر کلوروی، داستان اقبال، لاہور نشریات، ۲۰۰۹ء، ص ۱۷۔۱۸

۲ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۹۳ء، ص ۷

۳ ڈاکٹر صابر کلوروی، داستان اقبال، لاہور نشریات، ۲۰۰۹ء، ص ۲۰

۴ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال سوانح اور افکار، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی ۲۰۱۶ء، ص ۱۳

۵ ڈاکٹر صابر کلوروی، داستان اقبال، لاہور: نشریات، ۲۰۰۹ء، ص ۲۱

۶ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال سوانح اور افکار، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی ۲۰۱۶ء، ص ۱۳

۷ رفیع الدین ہاشمی، اقبال کی طویل نظمیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص ۸۷

۸ سید وقار عظیم، رائے، مشمولہ، اقبال کی طویل نظمیں، از: رفیع الدین ہاشمی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص ۸۵

۹ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵

۱۰ ایضاً، ص ۱۵

۱۱ رفیع الدین ہاشمی، اقبال کی طویل نظمیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص ۸۸

۱۲ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال سوانح اور افکار، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی ۲۰۱۶ء، ص ۱۷

۱۳ ایضاً، ص ۱۸

۱۴ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷

۱۵ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال سوانح اور افکار، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی ۲۰۱۶ء، ص ۱۹_۲۰

۱۶ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، لاہور: بزم اقبال، 1993ء، ص ۱۸

۱۷ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، لاہور: بزم اقبال، 1993ء، ص ۲۳

۱۸ ایضاً، ص ۲۲_۲۳

۱۹ ایضاً، ص ۲۳

۲۰ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال سوانح اور افکار، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی ۲۰۱۶ء، ص ۴۱

۲۱ ایضاً، ص ۴۲

۲۲ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، لاہور: بزم اقبال، 1993ء، ص ۵۰

۲۳ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، لاہور: بزم اقبال، 1993ء، ص ۵۲

۲۴ ایضاً، ص ۵۳

۲۵ ایضاً، ص ۵۴

۲۶ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال سوانح اور افکار، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی ۲۰۱۶ء، ص ۴۳

۲۷ ایضاً، ص ۴۴

۲۸ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، لاہور: بزم اقبال ۱۹۹۳ء، ص ۵۵

۲۹ ڈاکٹر صابر کلوروی، داستان اقبال، نشریات لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۵۲

۳۰ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال سوانح اور افکار، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی ۲۰۱۶ء، ص ۴۵

۳۱ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، لاہور: بزم اقبال ۱۹۹۳ء، ص ۶۴_۶۵

۳۲ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال سوانح اور افکار، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی ۲۰۱۶ء، ص ۴۶

۳۳ ڈاکٹر صابر کلوروی، داستان اقبال، نشریات لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۵۵

۳۴ ایضاً، ص ۵۶

۳۵ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال شخصیت اور فکروفن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۶

۳۶ ایضاً، ص ۱۵۱

۳۷ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال شخصیت اور فکروفن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۶

۳۸ ایضاً، ص ۱۷۰

۳۹ ڈاکٹر صابر کلوروی، داستان اقبال، نشریات لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۵۹

۴۰ ایضاً، ص ۶۰

۴۱ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال سوانح اور افکار، یونیورسٹی آف منیجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی ۲۰۱۶ء، ص ۳۲

۴۲ ڈاکٹر صابر کلوروی، داستان اقبال، نشریات لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۶۰ ـــ

۴۳ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال سوانح اور افکار، یونیورسٹی آف منیجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی ۲۰۱۶ء، ص ۳۳

۴۴ ایضاً، ص ۳۳

۴۵ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال شخصیت اور فکروفن"، اقبال اکادمی پاکستان ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۴

۴۶ ایضاً، ص ۱۸۵

۴۷ ایضاً، ص ۹۰

۴۸ ڈاکٹر صابر کلوروی، داستان اقبال، نشریات اردو بازار لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۸۱

۴۹ عطا محمد، اقبال نامہ (دوم)، ص ۳۲۱

۵۰ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال کی طویل نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۷۴

۵۱ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال شخصیت اور فکر و فن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۳

۵۲ ایضاً، ص ۲۱۵

۵۳ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۸۴

۵۴ ایضاً، ص ۱۸۴۔۱۸۵

۵۵ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال شخصیت اور فکر و فن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۲۵

۵۶ ایضاً، ص ۲۳۹

۵۷ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال شخصیت اور فکر و فن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۳۲

۵۸ ایضاً، ص ۲۸۲

۵۹ ایضاً، ص ۲۸۶

۶۰ ڈاکٹر صابر کلوروی، داستان اقبال، نشریات اردو بازار لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۵

۶۱ ایضاً، ص ۱۵۶

۶۲ ایضاً، ص ۱۶۷۔۱۶۸

○○○

علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ
کی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات

اور

اہم فرمودات

خدمتِ اسلام

علامہ افغانستان کے مطالعاتی سفر سے کوئٹہ بلوچستان کے راستے واپس آرہے تھے۔ سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود بھی ان کے ہم رکاب تھے۔ دورانِ گفت گو علامہ محمد اقبال کے والد ماجد شیخ نور محمد (میاں جی) کا ذکر آ گیا۔

علامہ: سید صاحب قبلہ، بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک روز میاں جی نے مجھ سے کہا:

"اقبال تمہارے ذمہ میرا ایک قرض ہے"

چوں کہ میں ان کے اشارہ کو سمجھا نہیں تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میاں جی وضاحت فرمایئے۔

سید سلیمان: پھر انھوں نے وضاحت کی۔

علامہ اقبال: جی ہاں۔ انھوں نے فرمایا:

"میں نے تمہاری تعلیم و تربیت میں بڑی کاوش کی ہے۔ میں اس کا صلہ چاہتا ہوں"

یہ سن کر میں مزید حیران ہوا۔

"عرض کیا میں کہاں اور آپ کہاں؟ میں آپ کی شفقتوں کا صلہ کیسے دے سکتا ہوں"

فرمایا:

"تمہیں خدمتِ اسلام کرنا ہے۔ یہی میرا صلہ ہوگا"

سید سلیمان: یہ کب کی بات ہے؟

علامہ اقبال: اسرارِ خودی سے پہلے کی۔

سید سلیمان: پھر بھی کبھی اس موضوع پر گفت گو ہوئی؟

علامہ اقبال: ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ایک روز میں نے جسارت کی اور پوچھا حضرت وہ آپ کا قرض کچھ ادا ہوا یا نہیں؟

سید سلیمان: پھر کیا فرمایا؟

علامہ اقبال: میرا جی اطمینان سے مسکرائے۔ ان کا اطمینان سے مسکرانا ہی میرے لیے بہت بڑا انعام تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میاں جی صاحب کشف بزرگ تھے۔ وہ مجھے دینی تعلیم ہی دلوانا چاہتے تھے اسی لیے انھوں نے مجھے شروع میں مولوی غلام حسن کے مدرسہ میں پڑھنے بٹھایا تھا۔"

("مکالمات اقبال" از: پروفیسر سید راشد علیگ، ص ۶۰ ۔ ۶۱)

○

غلط تو غلط ہی رہے گا

اقبال بچپن میں مولوی میر حسن کے مکتب میں تختی لکھ رہے تھے۔ لفظ غلط بجائے "ط" سے غلط لکھنے کے "ت" سے لکھ دیا۔ مولوی میر حسن نے دیکھا تو ٹوکا۔

میر حسن: اقبال غلط کو صحیح کرو۔

اقبال: جناب غلط تو غلط رہے گا اسے صحیح کیسے کروں۔

("سرگذشت اقبال")

○

اقبال دیر سے ہی آتا ہے

اقبال کے بچپن ہی کا قصہ ہے۔ مولوی میر حسن کے مدرسہ میں ایک روز اقبال ذرا دیر سے پہنچے۔

میر حسن: اقبال ! دیر سے آئے ہو ؟

اقبال: جناب !اقبال دیر ہی سے آتا ہے۔

(سرگذشت اقبال)

○

شاگر نوکر

مولوی میر حسن کے صاحبزادے ذکی شاہ راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت علامہ محمد اقبال ہمارے گھر کے لیے سودا سلف لے کر بازار سے لوٹے تو مولوی صاحب دروازے پر کھڑے کسی سے باتیں کر رہے تھے۔

میر حسن: اقبال ! میں نے تمھیں کتنی دفعہ کہا ہے کہ بازار سے ہمارا سودا نہ لایا کرو۔

اقبال: کیوں جناب، میرا قصور؟

میر حسن: تم میرے شاگرد ہو، نوکر نہیں ہو۔

اقبال: جناب ! میں آپ کا شاگر نوکر ہوں۔

(روایات اقبال)

○

اے سرزمین عرب

انگلستان جاتے ہوئے ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو جب حضرت علامہ محمد اقبال کا جہاز عدن کے قریب پہنچا تو ساحل عرب کے تصور نے حضرت علامہ محمد اقبال کو بے چین کر دیا۔ سرزمین عرب کو مخاطب کر کے کہا:

"اے عرب کی مقدس سرزمین تجھ کو مبارک ہو تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کے تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔

تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور مسلمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے گنہ گار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔

کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں چلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا اس متبرک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔"

("مقالات اقبال"، ص: ۴۷)

علی برادران کا شکوہ

امرتسر کے جلسے جلوسوں کے بعد محمد علی اور شوکت علی دونوں بھائی لاہور آئے ان کا جلوس لاہور ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوا اور کشمیری بازار سے ہوتا ہوا تمام بڑے بڑے بازاروں سے گزرا۔

نماز عصر کے وقت یہ جلوس انارکلی بازار میں تھا جب جلوس حضرت علامہ محمد اقبال کے مکان کے سامنے پہنچا تو دونوں بھائی حضرت علامہ محمد اقبال کے مکان پر چلے گئے جہاں انھوں نے پہلے نماز پڑھی پھر سیاست حاضرہ پر کچھ گفت گو ہوئی۔

محمد علی شوکت علی: ہم تو جیل کی مصیبت جھیلتے ہیں اور آپ کا کلام اس سلسلے میں مہمیز کا کام کرتا ہے مگر آپ ہیں کہ اپنی جگہ سے ہلتے ہی نہیں۔

علامہ: (مسکراکر) مولانا۔

''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است''

چوں کہ اس زمانے میں علی برادران کانگریسی تھے اس لیے حضرت علامہ محمد اقبال ان کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں تھے۔

(اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۵)

○

قرآن حکیم کی شرح لکھنے کی آرزو

خواجہ عبدالوحید کے حضرت علامہ محمد اقبال سے خاندانی مراسم تھے۔ کچھ قرابت داری بھی تھی حضرت علامہ محمد اقبال ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک ان کے بزرگوں کے گھر لٹی لاج میں اکثر شام کو کچھ وقت گزارتے تھے وہاں بچپن میں خواجہ صاحب نے حضرت علامہ محمد اقبال کو ایک عرصے تک قریب سے

دیکھا پھر بڑے ہو کر خود بھی حضرت علامہ محمد اقبال سے فیض اٹھایا، اور حضرت علامہ محمد اقبال کے ایماء پر ایک علمی ادارے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد رکھی اسی ادارے نے سب سے پہلے یوم اقبال بھی منایا۔

خواجہ عبدالوحید نے ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء کے دو سالوں میں حضرت علامہ محمد اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ اپنی ڈائری میں کیا ہے۔

عبدالوحید: السلام علیکم ڈاکٹر صاحب

علامہ: آؤ بیٹھو جی۔ کیا حال ہے تمہارا؟

خواجہ وحید: شکر ہے آپ سے نیاز حاصل کرنے حاضر ہوا ہوں۔

علامہ: ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی کیا خبر ہے؟

خواجہ وحید: ڈاکٹر ذاکر حسین کو جامعہ ملیہ دہلی لکھا ہے کہ ہم اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غازی حسین رؤف بے کا ایک لیکچر لاہور میں کرانا چاہتے ہیں۔

علامہ: یہ بہت اچھا کیا تم نے، غازی رؤف کے لیکچر کا بڑا اچھا اثر پڑے گا۔

خواجہ وحید: صدارت کے لیے آپ ہی کو زحمت دیں گے۔

علامہ: زحمت کیا، میں تیار ہوں۔

خواجہ وحید: اب آپ کی صحت کیسی ہے؟

علامہ: قدرے بہتر ہے، خدا سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اتنی مہلت ملے کہ اپنی زندگی کی سب سے اہم خدمت کر سکوں۔

خواجہ وحید: آپ کا عظیم کلام، آپ کے انگریزی لیکچرز کچھ کم ہیں۔

علامہ: اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی تفصیل سے اپنے اشعار میں کر دیا ہے لیکن ابھی میرے دل میں اس سے بھی بڑی ایک چیز ہے جو قرآن کریم کی شرح کی

صورت میں ظاہر کرنے کی آرزو رکھتا ہوں۔

○

''اسلام میرے نقطۂ نظر سے''

ایک مدت سے ہم سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔

لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لیے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق دیگر اقوام بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسان کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔

صوفی تبسم: گویا فقہ تشکیل جدید اس وقت سب سے اہم ضرورت ہے۔

علامہ: یقیناً

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے جیورس پروڈنس (اصول فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا۔

زمانہ حال کے فقہاء زمانہ کے سیلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآن ہی کا منکر ہے ہندوستان میں عام فقیہہ اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ امام ابو حنیفہ کی نظیر ناممکن ہے۔

غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیوں کہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسایا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(ملفوظات اقبال۔ ص ۳۱۸)

جناح کی زبان سے دین کا لفظ کتنا اچھا لگتا ہے

۲ فروری ۱۹۳۸ء کی شام کا ذکر ہے راجہ حسن اختر اور سید نذیر نیازی حاضر خدمت ہیں۔

علامہ: ملک کے کیا حالات ہیں؟

راجہ حسن اختر: دلی کی مسلم لیگ کے اجلاس کی کارروائی آئی ہے۔ (اخبار سے سناتے ہیں)

علامہ: جناح کی زبان سے دین کا لفظ کتنا اچھا لگتا ہے۔

نیازی: اب تو اس کی تقریروں میں ایجی ٹیشن کا رنگ آ چلا ہے۔

علامہ: مسٹر جناح کی تقریر مجھے بھی پڑھ کر سنایئے۔

نیازی: (پوری تقریر پڑھ کر سناتے ہیں)

علامہ: دو باتوں سے جی بہت خوش ہوا ہے ایک تو جناح کے اس کہنے پر کہ بندے ماترم سے شرم کی بو آتی ہے دوسرے اس پر کہ ہندی ہندوستانی کی تحریک دراصل اردو پردے میں بالواسطہ اسلامی تہذیب پر۔

(اقبال کے حضور، ص ۱۳۶)

○

لٹیری قومیں

جب کوئی قوم محنت و مشقت یا کسی اور ذریعے سے دولت کے ذخیرے جمع کرتی ہے اور اس اکتنازِ زر کے نتیجے میں دنیا کے کاروبار کی گاڑی تھم جاتی ہے، جس کی رفتار مسلسل گردش زر پر منحصر ہے، تو لٹیری قومیں نمودار ہوتی ہیں اور مقید دولت کو آزاد کر دیتی ہیں۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۴۰)

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کو دارالسلام پٹھان کوٹ بلوانے کا مشورہ

۱۹۳۸ء میں پنجاب ضلع پٹھان کوٹ میں جمال پور کے مقام پر ایک دین دار صاحب جائیداد مسلمان چوہدری نیاز علی نے ایک وسیع وقف قائم کیا تھا اس وقف کے سلسلہ میں چوہدری نیاز علی حضرت علامہ محمد اقبال سے مشورہ کرنے کے لیے حضرت علامہ محمد اقبال کی وفات سے چند ہفتے پہلے حاضر ہوئے۔ مشہور نومسلم انگریز علامہ محمد اسد بھی ان کے ساتھ تھے۔

نیاز علی: میں نے جمال پور میں ایک وقف دارالسلام کے نام سے قائم کیا ہے۔

اقبال: اس کا کوئی مقصد آپ کے ذہن میں ہوگا؟

نیاز علی: مقصد تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ اس کام میں رہنمائی فرمائیں آپ کے مشورے کے مطابق بعض علمائے دین کو دارالسلام آنے کی دعوت دی جائے۔

اقبال: دینی مدارس کی تو کوئی کمی نہیں ایک عام قسم کی درس نظامی کے مدرسے کو کھول دینے سے کچھ زیادہ حاصل نہ ہوگا، بہتر ہوگا کہ آپ اس وقف سے کوئی اور کام لیں۔

نیاز علی: آپ ہی فرمائیے کہ اس وقف سے کیا کام لیا جائے؟

اقبال: میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقہ اسلامی کی تشکیل جدید ہے۔ بحالت موجودہ ہم روز بروز اسلام سے دور ہٹتے جا رہے ہیں اور اس کی وجہ وہ سیاسی و اجتماعی مسائل ہیں جنھوں نے موجودہ زمانے میں ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء ان مسائل کو سمجھیں اور حالات کو اسلامی شرائع کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔

نیاز علی: علامہ صاحب! اکابر علماء کا تو دارالسلام آنا محال نظر آتا ہے وہ اپنے اپنے مراکز میں بیٹھے دینی

خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اقبال: یہ ٹھیک ہے کہ مگر اس کے باوجود ملک میں ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی کمی نہیں جن کے دل میں اسلام کا درد ہے اور جو مسائل حاضرہ سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان میں نئے اور پرانے تعلیم یافتہ سب ہی شامل ہیں۔ ضرورت اُن کو جمع کرنے کی ہے۔

(محمد اسد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

یہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں کیوں نہ اس کام کو ہاتھ میں لیں۔

نیاز علی: اسد صاحب ضرور اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں گے مگر اس کام کے لیے تو ایک جماعت کی ضرورت ہے۔

اقبال: آپ ٹھیک کہتے ہیں جہاں تک کچھ اور لوگوں کو جمع کرنے کا تعلق ہے شاید میں کچھ نام تجویز کر سکوں۔ سردست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے۔

نیاز علی: کون سا ؟

اقبال: حیدر آباد دکن سے ترجمان القرآن کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے۔ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں، میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں، دین کے ساتھ وہ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام مجھے بہت پسند آئی ہے۔ آپ کیوں نہ انھیں دارالسلام آنے کی دعوت دیں، میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کر لیں گے۔

نیاز علی: بہت بہتر، ان شاء اللہ ان ہی کو دعوت دی جائے گی۔

(رحیم بخش شاہین، ''اوراق گم گشتہ''، اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور، اپریل ۱۹۷۵ء، ص ۸۲)

○

قرآن حکیم اور اسوۂ رسول کریم ﷺ

حضرت علامہ محمد اقبال کے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام کے زمانے کی بات ہے۔ایک نئے ملاقاتی آئے ،اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ،اتنے میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال کر دیا کہنے لگے۔

ملاقاتی: آپ نے مذہب ،اقتصادیات ،سیاسیات ،تاریخ اور فلسفہ وغیرہ علوم پر جو کتابیں ابھی تک پڑھی ہیں ،ان میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر سے کون سی گزری ہے؟

علامہ: (کرسی سے اٹھ کر اندر جاتے ہوئے) نئے ملاقاتی کو ہاتھ کا اشارہ کیا کہ تم ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں ،یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔دو تین منٹ میں واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی ،اس کتاب کو انھوں نے اس شخص کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے فرمایا۔"قرآن کریم"

(فقیر سید وحید الدین، "روزگار فقیر" جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز، ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۹۳)

○

فقر کی منزل

فقر اور درویشی کی باتیں ہو رہی تھیں۔راجہ حسن اختر بھی بیٹھے تھے۔

راجہ حسن اختر: فقر کی پہلی منزل کیا ہے؟

علامہ اقبال: فقر کی پہلی منزل کسب حلال ہے ،نور ایمان بھی کسب حلال ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں مجھے ایک قصہ یاد آیا بغداد کے ایک بزرگ کی ہمشیرہ قاضی شہر کے پاس گئیں اور سوال کیا ہم غریب ہیں اور ہمارے گھر میں روشنی کا کوئی سامان نہیں ہے ہمارے پڑوس میں ایک آدمی رہتا ہے اس کی شمعوں کی روشنی ہمارے صحن میں بھی پڑتی ہے۔میں اس روشنی میں

مطالعہ کرتی ہوں فرمایئے کہ شریعت کی رو سے پڑوسی کے گھر کی روشنی کا یہ استعمال حلال ہے یا حرام ؟ قاضی تقوے کا یہ لطیف احساس دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ پوچھا آپ کون ہیں؟ خاتون نے جواب دیا۔ میں فلاں درویش کی ہمشیرہ ہوں۔ قاضی نے کہا۔ آپ کے لیے حرام ہے، دوسروں کے لیے حلال۔

راجہ حسن اختر کا بیان ہے کہ اس ذکر سے حضرت علامہ محمد اقبال پر سخت رقت طاری ہو گئی جس سے ہم سب ہم نشین متاثر ہوئے۔

(عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، بزم اقبال ۲ کلب روڈ لاہور، ۱۹۹۳ء۔ صفحہ ۲۴۷)

○

مشتاق رُتبہ علم دین

راج پال نامی ایک آریہ سماجی ہندو نے ایک دل آزار کتاب لکھی جس میں رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کی گئی تھی، اس حرکت سے سب مسلمان آزردہ اور مشتعل تھے۔ لاہور کے ایک نوجوان علم دین نے اسے قتل کر کے اس کو دریدہ دہنی کی سزا دی، جب یہ خبر حضرت علامہ محمد اقبال کو پہنچی تو حضرت علامہ محمد اقبال نے کہا:

"اسیں گلاں کردے رہے تو ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا"

(ہم تو باتیں ہی کرتے رہے، یہ بڑھئی کا بیٹا بازی لے گیا)

علم دین نے کھلم کھلا اقرار کیا تھا کہ قتل میں نے ہی کیا ہے لیکن اس کے رشتے دار چاہتے تھے کہ کسی طرح جان بچ جائے اور وہ اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے وہ لوگ حضرت علامہ محمد اقبال کے پاس آئے۔

رشتے دار: ڈاکٹر صاحب آپ بڑے نامی وکیل ہیں ہم چاہتے ہیں کہ آپ علم دین کو بچانے

میں کچھ ہماری مدد کریں۔

اقبال: اس نے بڑا نیک کام کیا ہے اس سے جھوٹ بلوا کر کیوں اس کی نیکی برباد کرتے ہو۔ اگر وہ شہید بھی ہو گیا تو بھی کوئی بات نہیں۔

("نقوش"، اقبال نمبر، صفحہ ۲۳۴)

○

مظلوم

بعض ایسے لوگ بھی مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں، جو نہ عربی زبان و ادب میں خاطر خواہ استعداد رکھتے ہیں، نہ عرب قدیم کے علمی سرمایہ پر ان کی نگاہ ہے نہ قرآن کریم کو ٹھیک طور پر سمجھ سکتے ہیں مگر اپنی اس علمی تہی مائیگی کے باوجود قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی کوشش فرماتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اس قسم کی باتوں سے بڑی اذیت ہوتی تھی۔ وہ اپنی متانت و سنجیدگی اور عالی ظرفی کے باوجود اس غم کو چھپا نہ سکے ایک بار فرما ہی دیا۔ قرآن کریم اس اعتبار سے بڑا ہی مظلوم صحیفہ ہے کہ جسے دنیا میں اور کوئی کام نہیں ملتا، وہ اس کے ترجمہ و تفسیر میں مصروف ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ نہایت ہی نازک اور محتاط ذمہ داری ہے۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۸۱)

○

شعر کا مفہوم

۱۹۳۷ء میں نواب زادہ راحت سعید خاں (چھتاری) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھتے تھے ایک روز ان کے استاد پروفیسر آل احمد سرور سے ڈاکٹر صاحب کے اس شعر پر ان کا اختلاف ہو گیا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

یہ شعر "بال جبریل" کا سرنامہ ہے اور مفہوم سنسکرت کے مہاکوی بھرتری ہری سے مستعار لیا گیا یا یوں سمجھئے کہ ان کے کسی دوہے یا چھند کا ترجمہ ہے۔

استاد کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ مصرعہ اولی استفہامیہ ہے اور اس میں انداز بیان یہ ہے کہ بھلا پھول کی پتی ہیرے کو کاٹ سکتی ہے اور جب پھول کی پتی سے ہیرا نہیں کٹ سکتا تو ناداں انسان پر نرم و نازک نصیحت کیوں کر کارگر اور اثر انداز ہو سکتی ہے؟

شاگرد کا انداز فکر مثبت تھا اور وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ تو ممکن ہے کہ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹ کر رکھ دیا جائے لیکن مرد ناداں پر نرم و نازک بات کا اثر ہو یہ ممکن نہیں۔ بحث خاصی طویل ہو گئی، استاد اور شاگرد دونوں اپنے اپنے موقف پر جمے ہوئے تھے، آخر طے پایا کہ ڈاکٹر صاحب سے شعر کا مفہوم دریافت کیا جائے، چناں چہ لاہور خط لکھا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"ہر دو مفہوم اپنی جگہ خوب ہیں لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اسے آنے والا وقت بخوبی سمجھ سکے گا۔"

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۸)

فنون لطیفہ کی تعبیر

افغانستان میں قیام کے دوران علامہ کے اعزاز میں انجمن ادبی کابل نے ایک خصوصی محفل آراستہ کی۔ ایک افغان شاعر عبداللہ خان نے اپنی خیر مقدمی نظم میں کہا کہ علامہ سے طرز مولانائے روم زندہ ہوگئی ہے۔

حضرت علامہ محمد اقبال نے سپاس نامے کا جواب دیا:

''میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے اسی بنا پر آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھا ہوں نہ کہ محض آلہ تفریح شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی۔

(ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، سرگزشت اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۳۵۵)

○

آرٹ کا عروج وزوال

سید عابد علی عابد کو دسمبر ۱۹۳۷ کے یوم اقبال کے جلسے میں ''اقبال اور فنون لطیفہ'' کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ اس سلسلہ میں علامہ سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے وہ راجہ حسن اختر کے ساتھ جاوید منزل حاضر ہوئے۔ اس وقت وہاں نذیر نیازی اور م۔ش بھی موجود تھے۔ موقع پا کر راجہ حسن اختر نے بات چھیڑی۔

راجہ حسن اختر: عابد صاحب اقبال اور فنون لطیفہ کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھ رہے ہیں۔

اقبال: (سید عابد علی عابد کو متجسس عقابی نظروں سے دیکھتے ہوئے) میرے کلام کو آرٹ سے کیا تعلق

ہے؟ میری شاعری اسلامی تفکر اور فقہ کی تفسیر وتعبیر ہے۔

عابد علی: میرا مقصد اس کی وضاحت کرنا ہے کہ آپ کے خیال میں فنون لطیفہ کا نصب العین کیا ہے؟

اقبال: ہاں اس اعتبار سے مقالہ لکھا جاتا ہے۔

عابد علی: آرٹ کے زوال پذیر ہونے کے جو محرکات ہوتے ہیں ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

اقبال: آرٹ کی زوال پذیری دراصل اقوام کی مجموعی زوال پذیری کے تابع ہوتی ہے جب تک اللہ تعالیٰ کو کسی قوم سے کچھ کام لینا مقصود ہوتا ہے اور اسے سرداری کے منصب پر فائز رکھنا منظور ہوتا ہے۔ اس وقت تک آرٹ زندہ اور جان دار رہتا ہے۔ بل کہ سب سے پہلے کسی قوم کی زوال پذیری کی علامت آرٹ کی زوال پذیری کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔

نذیر نیازی: ان حالات میں کیا شاعری سب سے پہلے متاثر ہوتی ہے۔

علامہ: ضروری نہیں، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے۔

جب کوئی قوم زوال پذیری پر آمادہ ہو جاتی ہے تو ٹھوس چیزوں کے مغز سے، معنی سے بیگانہ ہو جاتی ہے چھلکے سے شکل سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے، یہی آرٹ کی زوال پذیری ہے۔

عابد علی: اردو شاعری میں شاید ناسخ اور اس کے سکول کا کلام آپ کے ارشاد کی بہترین تفسیر ہے۔

علامہ: میں نے ناسخ اور اس کے سکول کا کلام بہت کم پڑھا ہے میرا اردو ادبیات کا مطالعہ بہت محدود ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اردو کی تاریخ میں دکنی ادبیات کا حصہ نسبتاً جان دار نظر آتا ہے۔

نذیر نیازی: شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ دکنی ادبیات کو مذہب سے نہایت گہرا تعلق رہا ہے۔

اقبال: ہاں یوں کہو کہ زندگی سے دکنی ادبیات کا تعلق اصلی اور اساسی ہے۔

عابد علی: رسالہ اردو کے ایک مقالہ نگار نے میر حسن اور ایک پرانے دکنی شاعر کی مثنویوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ دکنی شاعر کا کلام زیادہ جاندار اور پر جوش ہے۔

علامہ: میر حسن کے وقت تک اردو شاعروں میں کافی ژولیدہ بیانی پیدا ہو چکی تھی یا تو کچھ کہنا ہی نہیں

چاہتے تھے یا کہنا چاہتے تھے تو کہہ نہیں سکتے تھے بل کہ جو بزرگوار کچھ کہنا چاہتے تھے ان کے کلام میں بھی ایک خاص قسم کی ژولیدہ گفتاری ہے جو ذہنی ژولیدگی اور پریشان فکری کی خبر دیتی ہے۔

عابد علی: اس قسم کی ژولیدہ گفتاری کا معیاری نمونہ غالب کا ابتدائی کلام سمجھا جائے گا۔

نذیر نیازی: جیسے

صفائی حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر
تغیر آب بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

علامہ: (قدرے توقف کے بعد) کسی حد تک لیکن غالب سے کہیں زیادہ مومن ژولیدہ گفتار ہے۔ (بات بدل کر)

ایک جرمن مصنف کہتا ہے کہ فلسفے کے نظام دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وزنی، ان میں مغز زیادہ ہوتا ہے دوسرا ذرا ہلکا جب قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں تو ہر ٹھوس چیز سے بیگانہ ہو جاتی ہیں۔

عابد علی: کیا آرٹ بھی وزنی اور ہلکا ہو سکتا ہے؟

علامہ: ہو سکتا ہے۔ زوال پذیر اقوام میں آرٹ کا رس نچوڑ کر نہیں پیا جاتا بل کہ چھلکے کی شکل بنا دی جاتی ہے اور اس کے رنگ کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔

عابد علی: آرٹ کی عظمت کا انحصار کس چیز پر ہے شکل پر یا مغز پر؟

علامہ: یوں تو شکل بھی مغز ہی کا ایک پہلو ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آرٹ کی عظمت کا معیار مغز کی صحت مندی اور توانائی پر ہوتا ہے۔

(پروفیسر سعید راشد علیگ، مکالمات اقبال، بک کارنر شوروم جہلم، ۲۰۱۳ء، ص ۲۷۲)

○

ایک لطیفہ

ایک مرتبہ سر فضل حسین اور سر محمد اقبال ایک دوسرے کے بالمقابل "ٹرپ" (تاش کے ایک کھیل کا نام) کھیل رہے تھے کہ:

سر فضل حسین نے کہا: "میرا رنگ اینٹ ہے"

ڈاکٹر اقبال بے تکلف بولے کہ بھائی! اس رنگ کے ساتھ تو تمہارا بیر تھا تم نے اینٹ کیوں بولی؟ پنجابی میں مثل ہے کہ "اینٹ اور کتے کا بیر" یہ اسی طرف اشارہ تھا۔

(ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، روایات اقبال، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۹۷)

○

سائنس اور مذہب

۴ مارچ ۱۹۲۷ء کو اسلامیہ کالج کے حبیبہ ہال میں مرزا بشیر الدین محمود نے سائنس اور مذہب کے موضوع پر تقریر کی۔ جلسہ کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی۔ تقریر کے خاتمہ پر علامہ اقبال نے مختصر سے الفاظ میں اس موضوع پر روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا:

مذہب، فلسفہ، طبیعات اور دیگر علوم و فنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں کیوں کہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنون حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا

استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسیات پر پرکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی۔

سائنس اور مذہب کے تصادم کا خیال غیر اسلامی ہے۔ قرآن کریم کے ہر صفحہ پر انسان کو مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور معتجائے نظریہ بتایا گیا ہے کہ قوائے فطرت کو مسخر کیا جائے چناں چہ قرآن پاک تو صاف الفاظ میں انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کرلے گا تو ستاروں سے بھی پرے پہنچنے کے قابل ہو جائے گے۔

(محمد رفیق افضل، (مرتب)، گفتار اقبال، ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۳)

○

غالب اور رومیؒ سے ملاقات

علامہ پر کبھی کبھی عمیق غور و فکر بلکہ یوں کہیے استغراق کی ایسی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات اور ماحول سے یکسر غافل ہو جاتے۔ آخر عمر میں ان کے دل و دماغ پر اس کیفیت کا غلبہ اور زیادہ ہونے لگا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے کمرے میں حسب معمول نیم دراز تھے اور کوئی ملاقاتی اس وقت موجود نہ تھا۔ اپنے دیرینہ خادم علی بخش کی آہٹ سن کر وہ چونک پڑے اور اسے مخاطب کر کے فرمایا:

علی بخش! میرے پاس مرزا غالب بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ جلد جاؤ اور انھیں واپس بلا لاؤ۔ علی بخش ایک فرماں بردار اور سادہ لوح خادم، علامہ کا حکم سنتے ہی باہر مرزا غالب کی

تلاش میں ناکام واپس آ گیا اور کہا، غالب صاحب مجھے نہیں ملے"

علامہ نے فرمایا "بھئی! تم کیا کہہ رہے ہو...... وہ ابھی تو میرے پاس اس کرسی پر بیٹھے ہوئے دیر تک باتیں کرتے رہے ہیں"

انتقال سے چند روز قبل بھی اس نوعیت کا واقعہ پیش آیا۔ اس دفعہ انھوں نے مولانا رومی کے متعلق علی بخش سے کہا کہ وہ ابھی میرے پاس سے گئے ہیں، انھیں واپس بلا لاؤ۔

اس بار بھی علی بخش مہمان کے خیالی پیکر کو باہر ڈھونڈ کر ناکام واپس آ گیا۔

علامہ کے استغراق کی یہ کیفیت تھی کہ انھوں نے نہ اپنی ہدایت پر کوئی توجہ دی نہ علی بخش کے جواب کو غور و فکر کی اہمیت کا مستحق سمجھا۔

انسانی عقل و دانش کے لیے ان حیران کن واقعات کے بارے میں علامہ نے کبھی کوئی ایسی بات وضاحت اور قطعیت کے ساتھ نہیں کہی، جس سے ان کے ساتھ پیش آنے والے ان چھوٹے چھوٹے، لیکن اہم واقعات پر روشنی پڑ سکتی، لیکن انھوں نے اپنی تعلیمات اور افکار میں زندگی میں حاصل ہونے والے ایسے وجدانی لمحات اور محسوسات کا بار بار ذکر کیا ہے۔ جب انسانی قلب و دماغ پر خاص کیفیتوں کا غلبہ ہوتا ہے اور اس کے غور و فکر کے سلسلے لامحدود وسعتوں سے مربوط یا ان میں گم ہو جاتے ہیں۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگارِ فقیر، جلد دوم، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۷)

○

احساسِ ندامت

اقبال کو ذات رسالت مآب ﷺ سے جو والہانہ محبت تھی، اس کا اظہار ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ ان کا تنہا یہ شعر:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

سوزِ عشق نبی کا آتش کدہ ہے۔

ایک مرتبہ علامہ نے اپنی چھوٹی ہمشیرہ کو خط میں لکھا کہ:

"میں جو اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے۔ اگر یہ قویٰ دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسول ﷺ کی میں کوئی خدمت کر سکتا اور جب مجھے یاد آتا ہے کہ والد مکرم مجھے علوم دین ہی پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی تو بھی وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ بہر حال جو کچھ خدا کے علم میں تھا، ہوا اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا، میں نے کیا لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا، اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے تھا اور زندگی تمام کمال نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بسر ہونی چاہیے تھی۔"

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر، جلد دوم، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۴۴۔۲۴۵)

○

میر حسن ہال

علامہ اقبال خود نگر نہیں، خود شناس تھے۔ انھیں اپنی شخصیت کا احساس اور اپنی خودی کا عرفان تھا۔ اس لیے اضافی نسبتوں کی طرف ان کا میلان نہیں رہا۔ انھیں اس کی کبھی خواہش نہیں ہوئی کہ کسی انجمن یا ادارے میں انھیں کوئی عہدہ دیا جائے۔ جلسوں کی صدارتوں کا بھی انہیں شوق نہ تھا۔ لوگوں کے اصرار پر جب کبھی انہیں کسی اجتماع یا کانفرنس کی صدارت کرنا پڑی تو اہل نظر نے محسوس کیا کہ وہ اسے ذاتی اعزاز سمجھ کر نہیں، محض قومی خدمت جان کر ادا کر رہے ہیں۔

ایک بار یہ تجویز ہوا کہ اقبال کے نام سے ایک فوجی اسکول قائم کیا جائے۔ علامہ نے تجویز پیش کرنے والے فوجی افسر کو جواب دیا کہ ایک شاعر کے نام سے فوجی اسکول کو منسوب اور موسوم کرنا موزوں نہیں ہے اور پھر خود تجویز کیا کہ اس اسکول کا نام "ٹیپو فوجی اسکول" رکھا جائے۔

اعجاز صاحب کا بیان ہے کہ ایک رسم افتتاح انجام دینے کے لیے انھیں اپنے منتخب نہ کیے جانے کا ضرور ملال ہوا۔ سیال کوٹ میں ایک انجمن اسلامیہ ہے جو دوسرے قومی کاموں کے علاوہ ایک ہائی اسکول بھی اپنے اہتمام سے چلاتی ہے۔ جب اس اسکول کی نئی عمارت بن کر تیار ہوئی، انجمن کی مجلس منتظمہ نے اسکول کے ہال کا نام علامہ اقبال کے استاد مولانا میر حسن کے نام پر "میر حسن ہال" رکھا۔ اس ہال کی رسم افتتاح کے لیے انجمن والوں نے حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم کو دعوت دی۔ وزیر صاحب تشریف لائے اور ان کے ہاتھوں یہ رسم انجام کو پہنچی۔ علامہ اقبال کو انجمن والوں کی یہ حکام پرستی پسند نہیں آئی۔ انھوں نے ایک صحبت میں اپنے اس جذبے کا اظہار بھی کر دیا۔ فرمایا کہ انجمن والوں نے میرے استاد کے نام سے ہال منسوب کیا۔ مناسب یہ تھا کہ ان کا شاگرد اس کا افتتاح کرتا اور لوگوں کو بتاتا کہ مولانا میر حسن کیا تھے؟ مگر انجمن والوں نے حکام پرستی کے شوق میں حکومت کے وزیر کا اس کے لیے انتخاب کیا۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر، جلد دوم، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۵۱)

اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ اور توکل

علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس قدر بھروسہ اور توکل تھا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں متردد اور پریشان نہ ہوتے تھے۔ ان کے اندر راضی برضا رہنے کی سچ مچ کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ قناعت کے ساتھ خودداری اور صبر کے ساتھ توکل۔ یہ ان کے کردار کا نمایاں پہلو ہے۔ علامہ دوسروں کو بھی "توکل علی اللہ" کی تلقین فرماتے اور اس انداز میں نصیحت کے کلمات کہتے کہ یاس و نومیدی کی بجائے امید و رجا اور حوصلہ پیدا ہو۔

شیخ اعجاز احمد ۱۹۲۲ء میں جب انکم ٹیکس افسر مقرر ہو کر ٹریننگ کے لیے پشاور بھیجے گئے اور وہاں ایک عیسائی ٹریننگ افسر کے تعصب سے سابقہ پڑا تو انھوں نے اس افسر کے غیر ہمدردانہ اور متعصبانہ رویے کا حال لکھ کر علامہ کو بھیجا۔ علامہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

رزق انسان کا عمرو زید کے ہاتھ میں نہیں، خدا کے ہاتھ میں ہے

رزق از وے جو ، مجو از زید و عمر

مستی از وے جو ، مجو از بنگ و خمر

تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیے اور ہر قسم کی فکر دل سے نکال دینی چاہیے۔ خدا کارساز ہے اور انسان کی فکر اس کے لیے باعث آزار ہے۔ بالفرض اگر تم کو اپنی موجودہ مہم میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر کیا خدا تعالیٰ رزق کا کوئی اور سامنا پیدا کر دے گا۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ غرض یہ ہے کہ انسان کو اپنی صحت و حالت کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرنی چاہیے اور نتائج خدا کے سپرد کر دینے چاہئیں۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر، جلد دوم، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۳۱)

○

اسلام کا تصور خدا

عیسائیت نے خدا کی رحمت و شفقت پر زور دیا ہے اور اسلام نے قادر مطلق خدا کا تصور پیش کیا ہے۔ ہم ان دو تصورات میں کیسے محاکمہ کریں؟ میرا خیال ہے کائنات اور نوع انسانی کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان میں سے کون سا تصور صحیح تر ہے۔ میں تاریخ میں خدا کی رحمت و شفقت سے زیادہ اس کی قدرت کا ظہور دیکھتا ہوں۔ میری مراد یہ ہے کہ تاریخی تجربے کی بنا پر خدا کو قادر مطلق کہنا زیادہ مناسب ہے۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۷۰)

○

ملی اتحاد

اسلام اور وطن پرستی کے بارے میں جو کچھ پہلے لکھ چکا ہوں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے ملی اتحاد کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذہبی اصول پر ہماری گرفت مضبوط ہو۔ جونہی یہ گرفت ڈھیلی پڑی ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ شاید ہمارا وہی انجام ہو جو یہودیوں کا ہوا۔ اس گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں کسی معاشرے میں مذہب کا سب سے بڑا امین و محافظ کون ہوتا ہے؟ عورت ہوتی ہے۔ مسلم خواتین کو صحیح مذہبی تعلیم حاصل ہونی چاہیے کیوں کہ وہی قوم کی حقیقی معمار ہیں۔ میں آزاد نظام تعلیم کا قائل نہیں۔ تعلیم بھی دیگر امور کی طرح قومی ضروریات کی تابع ہوتی ہے۔ ہمارے مقاصد کے پیش نظر، مسلم بچیوں کے لیے مذہبی تعلیم بالکل کافی ہے۔ ایسے تمام مضامین جن میں عورت کو نسوانیت اور دین سے محروم کر دینے کا میلان پایا جائے۔ احتیاط کے ساتھ تعلیم نسواں کے نصاب سے خارج کر دیئے جائیں۔ لیکن

ہمارے ماہرین تعلیم اب بھی اندھیرے میں ٹٹول رہے ہیں۔ انھیں اب تک لڑکیوں کا نصاب تعلیم مقرر کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ شاید مغربی تصورات کی چمک دمک سے ان کی آنکھیں اتنی خیرہ ہوگئی ہیں کہ وہ اسلامیت اور مغربیت کے اس واضح فرق کو بھی نہیں سمجھتے کہ ایک طرف اسلامیت، خالصتہً ایک مجرد تصور یعنی مذہب کی بنیاد پر قومیت کی تعمیر کرتی ہے، دوسری طرف مغربیت ہے، جس کے لیے تصور قومیت کی روح ایک مادی شے یعنی ملک ہے۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۸۶)

○

نطشے کا جنوں

انسان کی فطرت عجیب تضادات کا مجموعہ ہے۔ اگر میں کسی طوائف سے شادی کرلوں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے ناپاک رشتوں پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اگر آپ میرے اس فعل کو حرف و حکایت کا موضوع بنائیں تو مجھے برا لگے گا یعنی جس بات کو میں عملاً روا رکھتا ہوں، اسے نظریاتی طور پر مسترد کر دیتا ہوں۔ نطشے کا فلسفہ، کم از کم اخلاقیات کے دائرے میں، یورپ کے طرز عمل کو عقلی جواز فراہم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ لیکن اشرافیہ کا یہ عظیم پیغمبر یورپ بھر میں مردود قرار دیا گیا ہے۔ بہت کم لوگ اس کے جنوں کے رمز آشنا ہیں۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۹۵-۹۶)

○

ہیگل، گوئٹے، غالب، بیدل اور ورڈز ورتھ

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، عبدالقادر بیدل، اور ورڈز ورتھ، سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی۔ بیدل اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور ورڈز ورتھ نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچالیا۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۰۵)

○

عالمی تہذیب میں یہود کا حصہ

عالمی تہذیب کے ارتقاء میں یہودی عنصر کی مقدار اتنی ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہود نے شاید سب سے پہلے کاروباری اخلاق کے اصول وضع کیے، جن کا خلاصہ تصور دیانت ہے۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۰۷)

○

حیات بطور تنقید شعر

آرنلڈ نے شعر کو تنقید حیات قرار دیا ہے لیکن یہ بات بھی یکساں طور پر درست ہے کہ خود حیات تنقید شعر ہے۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۹۰)

دشمنوں سے محبت

محبت اکسیر سے بڑھ کر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اکسیر ادنیٰ دھاتوں کو سونا بنا دیتی ہے۔ لیکن محبت تمام سفلی جذبات کو خود اپنے پاکیزہ وجود میں تبدیل کر دیتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مہاتما بدھ نے محبت کی ماہیت کا بالکل صحیح ادراک کیا۔ لیکن اخلاق عینیت کے جوش میں وہ حقائق زندگی کو نظر انداز کر گئے۔ انسان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے دشمنوں سے محبت کرے، بڑی زیادتی ہے ممکن ہے کہ بعض غیر معمولی افراد نے اپنی زندگی میں اس مقولے کو اپنایا ہو لیکن قومی اخلاق کے اصول کے طور پر یہ مقولہ باطل ثابت ہوتا ہے۔ اگر اہل جاپان ان اخلاقی اصولوں پر عمل پیرا ہوتے جو ان کے مذہب سے منسوب ہیں تو جنگ روس و جاپان کے نتائج بالکل مختلف ہوتے۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۵)

○

ملٹن

ملٹن کی کٹر عیسائی الٰہیات، ہمارے عہد کے تخیل کو مسائر نہیں کر سکتی۔ بہت کم لوگ ملٹن کا مطالعہ کرتے ہیں۔ والٹیئر کا یہ قول بالکل درست ہے کہ ملٹن کی مقبولیت برابر بڑھتی جائے گی کیوں کہ اسے کوئی پڑھتا ہی نہیں۔ بہر حال ملٹن میں ایک خاص بات ضرور ہے۔ کوئی شاعر اپنے مقصد میں اس سے زیادہ مخلص نہیں گزرا۔ اس کے بلیغ اسلوب کو جو جھوٹے دیوتاؤں کا ایک عظیم الشان حرم ہے، زمانے کے مفلوج ہاتھ کبھی چھو نہ سکیں گے۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۸)

اقلیتوں کی قوت

دنیا کی تقدیر کا فیصلہ خاص طور پر اقلیتوں کے ہاتھ رہا ہے۔ یورپ کی تاریخ اس دعوے کی صداقت پر کافی شہادت پیش کرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اس کا کوئی نفسیاتی سبب ضرور ہے کہ اقلیتیں ایک قوی عامل کی حیثیت سے تاریخ انسانیت پر کیوں اثر انداز رہی ہیں۔ کردار ہی وہ غیر مرئی قوت ہے جس سے قوموں کے مقدر متعین ہوتے ہیں اور اکثریتی جماعت میں کردار کی استواری ناممکن ہے۔ یہ نہ ایک قوت ہے۔ جتنا ہی اسے تقسیم کیا جائے، اسی قدر یہ کمزور تر ہو جاتی ہے۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۲۴)

○

حیرت

افلاطون کا قول ہے کہ حیرت تمام علوم کی ماں ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدل حیرت کو ایک مختلف زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

افلاطون کے نزدیک حیرت اس لیے قابل قدر ہے کہ اس سے فطرت کے بارے میں ہمارے تجسس کی تحریک ہوتی ہے۔ بیدل کے لیے حیرت، اپنے ذہنی نتائج واثرات سے قطع نظر، فی نفسہ قابل قدر ہے۔ اس خیال کا اظہار بیدل کے اس شعر سے زیادہ حسین تر پیرائے میں ممکن نہیں۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۲۸)

تاریخ کی توجیہہ

تاریخ محض انسانی محرکات کی توجیہہ وتفسیر ہے لیکن جب ہم اپنے معاصرین بلکہ روزمرہ زندگی میں گہرے دوستوں اور رفیقوں کے محرکات کی بھی غلط توجیہیں کر بیٹھتے ہیں تو جو لوگ ہم سے صدیوں پہلے گزرے ہیں، ان کے محرکات کی صحیح تعبیر وتوجیہ اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ لہٰذا تاریخ کی روداد کو بڑے احتیاط سے تسلیم کرنا چاہیے۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتبہ) شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۰)

○

عالمگیر سلطنت

اسلام ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہتوں اور سرمایہ داروں کی گنجائش نہ ہوگی۔ دنیا کا تجربہ خود ایسی سلطنت پیدا کردے گا۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں شاید یہ محض خواب ہو لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے۔

(گفتار اقبال، ص ۱۷۸)

○

اٹل قوانین

قدرت کی قوتوں کی نظروں میں نہ افراد کی وقعت ہے نہ اقوام کی منزلت۔ اس کے اٹل قوانین

برابر اپنا عمل کیے جا رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کی منزل مقصود بہت ہی دور ہے۔ جسے مقاصد انسانی کے آغاز و انجام سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔

(مقالات اقبال، ص ۱۱۵)

○

بات ذرا سی

بعض اوقات بات ذرا سی ہوتی ہے لیکن انسان ہے کہ اپنے مستقبل سے کہیں دور ہٹ جاتا ہے، ہم ایک قدم اٹھاتے ہیں، سمجھتے ہیں آگے بڑھیں گے لیکن یہی قدم ہمیں پیچھے لے جاتا ہے۔ ایک چیز ہاتھ آتی ہے، خیال ہوتا ہے، بہت بڑی نعمت مل گئی لیکن آگے چل کر وہی چیز زنجیر پا ہو جاتی ہے انسان ہے کہ بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

(اقبال کے حضور۔ ص ۲۱)

ہمارا غم

آدمی اگر کچھ وقت کے بعد اپنے مصائب اور غم کو بھول جاتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وقت میں کوئی پوشیدہ قوت ہے۔ جس سے وہ انسانی غموں کو پرانا کر کے فنا کر دیتا ہے۔ ہم جو مرنے والوں کو فراموش کر دیتے ہیں تو یہ فراموشی وقت کے گذر جانے کا اثر نہیں بل کہ ہماری فطرت میں ایک احساس مخفی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا۔ اس لطیف احساس کی وجہ سے ہمارا غم دور ہو جاتا ہے میں گزرے ہوئے عزیزوں کی طرف سے بے پروائی اور گونہ غفلت روح کے اس احساس کی وجہ سے ہے کہ ہمارے عزیز زندہ موجود ہیں اگر وہ حقیقت میں فنا ہو چکے ہوتے تو یقیناً ہمارا غم کبھی ختم نہ ہوتا۔

(عزیز احمد قول اقبال، ص ۱۰)

○

استاد کی عظمت

۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے، جب ڈاکٹر صاحب انار کلی والے مکان میں رہتے تھے، سید محمد عبداللہ ان سے ملنے کے لیے وہاں گئے، ڈاکٹر صاحب ان سے فرمانے لگے۔

''عبداللہ جی یورپ کا کوئی ایسا بڑا عالم یا فلسفی نہیں ہے ORIENTAL AND OCCIDENTAL مستشرق یا مستغرب جس سے میں نہ ملا ہوں، یا کسی نہ کسی موضوع پر بے جھجک بات نہ کی ہو، لیکن نہ جانے کیا بات ہے شاہ جی (میر حسن صاحب) سے بات کرتے ہوئے میری قوت گویائی جواب دے جاتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، لیکن دل کی یہ بات با آسانی زبان پر لا نہیں سکتا۔''

ایک بار ڈاکٹر صاحب کو یہ کہتے بھی سنا گیا:

''شاہ جی کا کیا کہنا، شاہ جی کی ہر بات شعر ہوتی ہے''

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے استاد کا کس قدر احترام کرتے تھے اور ان کے لیے ڈاکٹر صاحب کے دل میں کتنی محبت، عظمت اور عقیدت تھی۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز: ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۱۰-۲۰۹)

○

احساسِ غرور

ایک دفعہ راجہ نریندر ناتھ نے ڈاکٹر صاحب کو چائے پر مدعو کیا۔ راجہ صاحب کے کمرے میں ہرن کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ان سے بچ بچ کے گزرے۔ راجہ نریندر ناتھ نے حیران ہو

کر وجہ پوچھی آپ نے جواب میں بتایا کہ میرے استاد محترم نے ایک مرتبہ میری دی ہوئی جائے نماز استعمال نہ کرنے کا سبب بتاتے ہوئے انکشاف کیا تھا کہ ہرن کی کھال پر بیٹھنے یا چلنے سے انسان کے دل میں لاشعوری طور پر غرور کا احساس پیدا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی مسلمہ بات ہے کہ جس کا ذکر حدیث شریف میں بھی موجود ہے۔ رلجہ زیندر ناتھ اس جواب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کئی منٹ تک وہ خاموش کھڑے ڈاکٹر صاحب کے چہرے کو تکتے رہے۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۴۷)

○

عورت کی ذمہ داری

ایک مرتبہ کہنے لگے کہ جس قوم نے عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی۔ وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنی غلطی پر پشیمان ہوئی ہے۔ عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے تو اسے کسی دوسرے کام کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ اگر اسے اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کے ایسے کاموں پر لگایا جائے جنہیں مرد انجام دے سکتا ہے۔ تو یہ طریق کار یقیناً غلط ہوگا مثلاً عورت کو جس کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے ٹائپسٹ یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی معاشرہ کو درہم و برہم کرنے کی افسوس ناک کوشش ہے۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۶۶)

ایک عقیدت مند

میرے ایک دوست شریف احمد ریلوے میں ملازم تھے۔ انہیں حکیم الامت سے اس قدر عقیدت تھی کہ انھوں نے مرحوم کے کلام کا بیشتر حصہ حفظ کر لیا تھا اور ہمیشہ اس کا ورد کرتے رہتے تھے ایک

دن میں نے ان سے دریافت کیا۔تم ڈاکٹر صاحب کے کلام پر اتنے فریفتہ ہو لیکن کبھی ان سے ملے بھی ہو۔انھوں نے جواب دیا مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع تو نہیں ملا۔البتہ اشتیاق ضرور ہے میں شریف احمد کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گیا اور ان کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے کہا" قبلہ جس طرح میکالے نے کہا ہے کہ اگر ملٹن کی نظم PARADISE LOST کے تمام نسخے نیست و نابود ہو جائیں تو میں حافظے کی مدد سے اسے لکھوا سکتا ہوں۔اسی طرح میرا یہ دوست آپ کے کلام کا حافظ اور اس لحاظ سے دوسرا میکالے ہے۔یہ سن کے ان کے چہرے پر جو علالت کی وجہ سے مضمحل ہو رہا تھا۔ مسرت کی لہر دوڑ گئی اور آنکھوں میں ایک تیز سی چمک پیدا ہو گئی۔اس واقعہ سے چند ہفتوں کے بعد ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا۔شریف احمد کو اب تک اس بات پر بڑا فخر ہے کہ اسے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے گفتگو کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔

(فقیر سید وحید الدین،روزگار فقیر جلد اول،آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور،۱۹۸۸ء،ص ۶۳)

○

وطن کی بہنیں

اخبار وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خان ڈاکٹر صاحب کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب انارکلی میں رہتے تھے۔انارکلی میں کشمیری طوائفیں بھی رہتی تھیں۔میونسپلٹی نے ان کے لیے دوسری جگہ تجویز کی۔چناں چہ انہیں وہاں سے اٹھوا دیا گیا۔اس زمانے میں مولوی انشاء اللہ خان کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔اتفاق سے ایک دن جو گئے تو ڈاکٹر صاحب گھر پر موجود تھے۔مولوی صاحب نے کہا ڈاکٹر صاحب جب سے طوائفیں انارکلی سے اٹھوا دی گئی ہیں۔آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا۔ڈاکٹر صاحب نے جواب

دیا۔ مولوی صاحب آخر وہ بھی تو "وطن کی بھینس" ہیں۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۶۴)

○

شاعر کی آنکھیں

ایک دفعہ میں نے زمانہ کی قدر ناشناسی کا ذکر کیا اور کہا کہ لوگ اپنے ملک کے بڑے بڑے شاعروں، قومی رہنماؤں اور عظیم المرتبت انسانوں کی زندگی میں ان کی قدر نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب اس سوال سے بہت متاثر ہوئے اور کسی قدر تامل کے بعد فرمایا۔ تم غور کرو تو معلوم ہوگا کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو دنیا کی بند ہوتی ہیں اور جب شاعر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتی ہیں تو دنیا کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ صدیوں تک اس کی تعریف و توصیف کے گیت گاتی رہتی ہے۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۶۵)

○

یہ تو آدمی ہیں

میرے ایک قریبی رشتہ دار سید واجد علی کو کتے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ میں ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کے ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا۔ موٹر میں ان کے کتے بھی تھے۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی: "ابا جان موٹر میں کتے آئے ہیں"

ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا "نہیں بیٹا یہ تو آدمی ہیں"

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۷۱)

○

اندیشۂ مرگ

گلے کی تکلیف میں ایک ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کو دیکھنے آیا۔اس نے چند دوائیں تجویز کیں۔ پھر کہنے لگا۔اس مرض میں پرہیز ضروری ہے۔فلاں فلاں چیزوں سے پرہیز کیجئے۔علامہ نے پوچھا لیکن اگر میں آپ کی ہدایات پر عمل نہ کروں تو۔ڈاکٹر نے جواب دیا تو خدانخواستہ آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔حکیم الامت کہنے لگے۔ڈاکٹر صاحب کیا انسان کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا ہے جو موت کے خطرے سے خالی ہے۔

ڈاکٹر یہ سن کر حیران رہ گیا اور پھر کہنے لگا۔آپ کی سی طبیعت کا مریض میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۷۲)

○

پتھر

ایک بار محفل میں اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے ان کارناموں کا ذکر چل پڑا۔جن سے مسلمانوں کی غیر معمولی شجاعت، بے جگری اور بے مثال سرفروشی کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے اس گفتگو میں حصہ لیا، وہ بولے:

مسلمان ایک ایسا پتھر ہے کہ جس پر گرتا ہے اسے پاش پاش کر دیتا ہے اور جو اس پر گرتا ہے پاش پاش ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم نے مرد مومن کی اس شان کو اشداء علی الکفار کے انداز میں پیش فرمایا ہے جس کی

ترجمانی علامہ اقبال نے ان لفظوں میں کی ہے۔

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

مگر

مردِ مومن کی دوسری شان "ورحماء بینھم بھی ہے

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۴۳)

○

رونق

ڈاکٹر صاحب کے متین و سنجیدہ چہرے پر جیسی رونق میں نے ایک بار دیکھی، پھر اس انداز کی رونق کبھی نہیں دیکھی! ہوا یہ کہ میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ حسب معمول بستر پر نیم دراز حالت میں آرام فرما تھے، میں نے سلام کیا، بڑی شفقت کے ساتھ سلام کا جواب دیا، میں قریب بیٹھ گیا، اور موقع محل دیکھ کر گفتگو کے دوران میں نے عرض کیا کہ ایک صاحب سے آپ کی شاعری پر گفتگو ہو رہی تھی، میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کے افکار و تخیل کا کیا کہنا، کئی مقامات پر تو انھوں نے ہزاروں سال کی تاریخ کو صرف ایک مصرعہ میں بیان کر دیا ہے، اسے کہتے ہیں دریا کو کوزے میں بند کر دینا، اس کے بعد میں نے مثال کے طور پر آپ کا یہ مصرعہ پڑھا۔

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر

میں نے اس مصرعہ کا مفہوم اپنے مخاطب پر یوں واضح کیا کہ انسان صرف محسوس کی جانے والی اور نظر آنے والی چیزوں کی پرستش کا عادی ہو چکا تھا۔۔۔ ظاہر ہے کہ انسان کی ہزاروں سال کی تاریخ اس کی اس کم نظری اور غلط اندیشی سے عبارت ہے کہ وہ دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف انداز کی

محسوس کی جانے اور نظر آنے والی قوتوں کو اپنا معبود و مسجود سمجھتا اور بناتا رہا۔ یہاں تک کہ اسلام نے اسے خدائے واحد و حقیقی کی طرف متوجہ کر دیا اور یہیں سے انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن دور شروع ہو جاتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب نے میرے معروضات کو بڑی توجہ سے سنا، اور میری بات ختم ہونے تک ان کے چہرے پر ایسی رونق پھیل گئی، جو میرے لیے بالکل انوکھی تھی، میں یہ جان کر خوش تھا کہ ڈاکٹر صاحب میری اس شعرفہمی کو حوصلہ افزائی کا مستحق قرار دے رہے ہیں۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۷۵)

○

میموں کا سایہ

میرے محترم دوست علی بہادر حبیب اللہ کے والد شیخ محمد حبیب اللہ سیدن پور ضلع بارہ بنکی یوپی کے معروف و مشہور تعلقہ دار تھے اور اودھ کے دوسرے تعلقہ داروں کی طرح زیادہ تر لکھنؤ میں رہا کرتے تھے، ان دنوں بچوں کو ولایت بھیج کر تعلیم حاصل کرانا بڑے فخر کی بات سمجھا جاتا تھا۔ چناں چہ علی بہادر بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ عالم کم سنی میں لندن بھیج دیے گئے، آٹھ سال کی عمر میں لندن جانا، اور پورے پندرہ سال بعد وہاں سے وطن واپسی، اس زمانے میں یقیناً بڑی غیر معمولی بات تھی، پھر علی بہادر حبیب اللہ نے تو ہندوستان آتے ہی بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا چناں چہ جب ۱۹۳۸ء میں وہ مسلم لیگ کے کارکن کی حیثیت سے لاہور آئے۔ اور ڈاکٹر اقبال سے ۔۔۔ بطور خاص ملاقات کی۔

تو ڈاکٹر صاحب نے ان سے دریافت کیا۔

"کیوں بھئی! ولایت ہو آئے"

اس کے جواب میں وہ فخریہ انداز میں بولے۔

"جی ہاں! میں تو آٹھ سال کی عمر ہی میں، انگلینڈ چلا گیا تھا"

اس جواب کو سن کر ڈاکٹر صاحب کی رگ ظرافت پھڑکی، ان سے نہ رہا گیا، مسکرا کر کہا۔

"پھر تو آپ کو یوں کہنا چاہیے۔

"میموں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں۔"

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۸۶)

○

مساوی حقوق

سب سے پہلے نبی عربﷺ نے انسان کو فطری آزادی کی تعلیم دی اور غلاموں اور آقاؤں کے حقوق کو مساوی قرار دے کر اس تمدنی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے نتائج کو اس وقت تمام دنیا محسوس کر رہی ہے ایسا کرنا گویا نوع انسان کے ایک کثیر حصے کو اس آزاد مقابلے کے میدان میں واپس لے آنا تھا جس کے اثر سے تمدن و تہذیب کی اعلیٰ صورتیں پیدا ہوتی ہیں اور جو دنیا کی تمام تہذیب و شائستگی کی بیخ و بنیاد ہے۔ حکیم عربﷺ کی اس مبارک تعلیم کا نتیجہ کیا ہوا؟ مسلمانوں میں غلام بادشاہ ہوئے، غلام وزیر ہوئے، غلاموں کو اعلیٰ تعلیم دی گئی۔ غلاموں میں فلسفی اور ادیب پیدا ہوئے۔ غرض کہ اس قبیح امتیاز کے مٹ جانے سے ہر غلام ایک اعلیٰ خاندانی آدمی کے ساتھ عقلی مقابلہ کر سکتا تھا اور اس مقابلے میں کامیاب ہو کر سلطنت کے اعلیٰ ترین مناصب پر پہنچ سکتا تھا۔ اس تعلیم کا سب سے اعلیٰ نمونہ جناب فاروقؓ نے پیش کیا جب کہ وہ بیت المقدس کی فتح کے لیے جا رہے تھے۔ جہاں تک مجھے

معلوم ہے دنیا کی کسی قوم کی تاریخ ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی اور مسلمان اس تعلیم پر جس قدر ناز کریں بجا ہے۔

(سید عبدالواحد معینی، مقالات اقبال، القمر انٹر پرائز زاردو بازار لاہور، ۱۹۱۱ء، ص ۸۱)

○

قومی زندگی

ہمارے زمانے میں ایک اور خاموش قوت ہے جس پر قوموں کی بقا و فنا انحصار کرتی ہے اور جس کے بل پر ایک قوم گھر بیٹھے دوسری قوم کو ہمیشہ کے لیے صفحہ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹا سکتی ہے۔ ہاتھوں کی لڑائی کا زمانہ گزر چکا۔ اب دماغوں، تہذیبوں اور تمدنوں کی ہنگامہ آرائیوں کا وقت ہے اور یہ جنگ ایک ایسی جنگ ہے جس کے زخم رسیدہ زنگاری اور کافوری مرہم سے ہرگز اچھے نہیں ہو سکتے۔ ظاہری فاصلہ جو قوموں کے خلا و ملا میں بمنزلہ ایک سد سکندری کے تھا۔ اب ریل اور پیام برقی کی حیرت انگیز ایجادوں سے گویا بالکل معدوم ہو گیا ہے اور وہ ممالک جو کبھی ناپیدا کنار سمندروں کی وجہ سے ایک دوسرے سے اس قدر دور تھے کہ ایک کو دوسرے کی ہستی کا بھی علم نہ تھا موجودہ صدی میں فن جہاز رانی کی تعجب خیز ترقی سے ایک شہر کے دو محلوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں، جس سے دنیا کی تمام قومیں ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن سے روز بروز متاثر ہو رہی ہیں۔

(سید عبدالواحد معینی، مقالات اقبال، القمر انٹر پرائز زاردو بازار لاہور، ۱۹۱۱ء، ص ۷۵)

○

عورت

عورت حقیقت میں تمام تمدن کی جڑ ہے۔ "ماں" اور "بیوی" دو ایسے پیارے لفظ ہیں کہ تمام

مذہبی اور تمدنی نیکیاں ان میں مستتر ہیں۔ اگر ماں کی محبت میں حب وطن اور حب قوم پوشیدہ ہے، جس میں سے تمام تمدنی نیکیاں بطور نتیجے کے پیدا ہوتی ہیں، تو بیوی کی محبت اس سوز کا آغاز ہے جس کو عشق الٰہی کہتے ہیں۔ پس ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فرد واحد کی تعلیم ہے، مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔

(سید عبدالواحد معینی، مقالات اقبال، اقمر انٹر پرائزز اردو بازار لاہور، ۱۹۱۱ء، ص ۹۲)

○

نصیحت

ایک بار کالج کے چند طلبا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجئے تاکہ اس کی روشنی میں اپنی زندگی کو سنوار سکیں۔ یہ زمانہ ڈاکٹر صاحب کی علالت کا تھا بے حد کمزور ہو گئے تھے زیادہ وقت آرام کرنے اور لیٹے رہنے میں گزرتا، اس وقت تک ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی تھیں طلباء کے جواب میں بس اتنا فرمایا:

اب تک جو کچھ میں کہہ چکا ہوں "پہلے اس پر عمل کیجئے"

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی سچی اور قیمتی بات فرمائی، لوگوں کا آج کل یہ فیشن ہو گیا ہے کہ بڑے آدمیوں سے تازہ "پیغام" مانگتے ہیں، اور اس سے پہلے دیے ہوئے "پیغاموں" پر عمل نہیں کرتے، بے عمل قوم عمل کی بجائے لفظوں سے کھیلتی ہے۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۹۳)

خدااورانسان کارشتہ

پروفیسر صاحب جواب تک فلسفہ میں ڈوبے ہوئے تھے اور جن پر تمام تر عقلیات کا غلبہ تھا، علامہ اقبال نے ان کی توجہات کا رخ مذہب کی طرف موڑ دیا، اور اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ قرآن کریم فلسفے اور الٰہیات کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ اس کا مقصد دل کو اطمینان عطا کرنا ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ قرآن کریم کو اس زاویہ نگاہ سے مت پڑھو کہ وہ تمہیں فلسفے کے مسائل سمجھائے گا بل کہ اسے اس زاویہ نگاہ سے پڑھو کہ اللہ تعالیٰ سے میرا کیا رشتہ ہے؟ اور کائنات میں میرا کیا مقام ہے؟ قرآن اس لیے نازل ہوا ہے کہ وہ انسان میں خدا سے ربط قلبی کا اعلیٰ شعور پیدا کردے تاکہ انسان اس ربط کی بدولت مشیت ایزدی سے ہم آہنگی پیدا کر سکے۔

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۹)

شاعراوروکیل

جس واقعہ کا میں ذکر کر رہا ہوں، ان دنوں سر شادی لال پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، اسی زمانہ میں برطانوی حکومت کے سامنے ڈاکٹر اقبال کو ہائی کورٹ کا جج مقرر کرنے کی تجویز زیر غور تھی۔ حکومت نے سر شادی لال کی رائے دریافت کی، کہ چیف جسٹس کی حیثیت سے جج کے تقرر کے لیے ان سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ سر شادی لال نے اس تجویز کی مخالفت کی اور مخالفانہ رپورٹ کا یہ

جملہ خوب مشہور ہوا۔

" We know him as a poet , but we do not know him as a Lawyer."

(فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر جلد اول، آتش فشاں پبلی کیشنز ایبٹ روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۳)

○

اردو میں پنجابی

اسی سلسلے میں فرمایا "میرا ہمیشہ ایسا خیال رہا ہے کہ پنجاب میں طلبہ کے لیے جو اردو کورس (نصاب) ہوں، ان میں حسب ضرورت پنجابی کے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں۔ مثلاً مولانا آزاد نے اپنے قاعدے میں ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ "لیزم ہلاؤ" دہلی میں تو یہ لفظ بچے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں مگر پنجاب میں بچے تو کیا سمجھیں گے، استاد بھی اس کے معنی دریافت کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس کے بجائے کوئی ایسا نام استعمال ہوتا جو اردو کا نہ سہی لیکن پنجاب میں عام ہوتا تو یقیناً یاد مفید رہتا۔ اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے پنجاب میں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ زراعت کی کتابوں میں بالخصوص پنجابی کے الفاظ بے تکلف استعمال کیے جائیں۔"

(اختر راہی، اسد ملتانی کے روزنامچے کے چند اوراق، مشمولہ "علامہ اقبال کی تابندہ یادیں" از ڈاکٹر ندیم شفیق ملک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۶۰۔۱۶۱)

○

مغرب کی تقلید

میں نے (اسد ملتانی) سوال کیا کہ پرسوں آپ نے فرمایا کہ ہمیں مغربی تہذیب کی نقل نہیں

کرنی چاہیے، اس سے اس کی فضیلت کا عملی اقرار ہوتا ہے، جس کے ہم اصولاً خلاف ہیں۔ ادھر ہم کہتے ہیں کہ مغربی علوم وفنون، تہذیب وتمدن کی بنیاد ہم نے رکھی۔ گویا ہم تمدن وترقی کو ایک خاص مقام پر پہنچا کر ٹھہر گئے اہل مغرب نے وہیں سے لے کر اسے آگے ترقی دی۔ اب چند صدیوں کے بعد ہم جو جاگے تو اہل مغرب کو کہیں سے کہیں پہنچا ہوا پایا۔ کیا اس وقت ہمیں اپنی قوت تخلیق سے کام لے کر اس مقام سے اپنی ترقی کی منزل شروع کرنی چاہیے جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا یا وہاں سے جہاں اسے اہل مغرب نے اس وقت پہنچا رکھا ہے؟ کیا مناسب نہ ہوگا کہ پہلے وہ سب کچھ حاصل کرلیں جو اہل مغرب معلوم کر چکے ہیں اور پھر اپنی قوت تخلیق کو بروئے کار لا کر آگے ترقی کریں؟ میرا خیال ہے کہ ترک اس وقت اسی چیز پر عمل کر رہے ہیں۔

اقبال : فرمایا کہ نقل اور اخذ میں بڑا فرق ہے۔ ترک نقل کر رہے ہیں، نہ کہ اخذ۔ نقل سے قوت تخلیق کمزور ہو جاتی ہے مگر اخذ ترقی کے لیے لازمی ہے۔ مغرب نے جو نئی تخلیقات اور ایجادات کی ہیں، ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان کو فوراً اخذ کر کے اپنی مزید ترقی کی بنیاد رکھیں۔ ایک یہ امر بھی مدنظر رہے کہ تقلید اور نقالی علوم اور سائنس میں مذموم نہیں بل کہ ضروری ہے لیکن مذہب، اخلاق اور تمدن میں یہ زہر کا حکم رکھتی ہے مثلاً ترکوں کو دیکھیے انھوں نے ہیٹ (انگریزی ٹوپی) کو علامت ترقی سمجھ لیا ہے، حالانکہ اصل چیز جو لازمہ ترقی ہے وہ ہیٹ کے نیچے ہے۔

(اختر راہی، اسد ملتانی کے روزنامچے کے چند اوراق، مشمولہ "علامہ اقبال کی تابندہ یادیں" از۔ ڈاکٹر ندیم شفیق ملک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۶۱-۱۶۲)

○

بندۂ مومن کی اذاں

ایک دن صبح کے وقت اقبال شیش محل کے سامنے والے میدان میں ٹہل رہے تھے۔ اس

تاریخی میدان کے چاروں طرف مساجد ہیں۔ میں علامہ کے ساتھ تھا۔ یکایک علامہ بہت بے چین نظر آئے۔ فرمایا اندر چلو۔ شیش محل پہنچ کر وہ اپنے پلنگ پر بیٹھ گئے اور کافی دیر تک بالکل خاموش رہنے کے بعد یہ دو شعر لکھوائے۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز — نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود — ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

(ممنون حسین خان، دارالاقبال بھوپال میں اقبال کا ورود مسعود، مشمولہ "علامہ اقبال کی تابندہ یادیں" از ڈاکٹر ندیم شفیق ملک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص: ۲۹۶)

○

آم سے رغبت

میووں میں سے آم انہیں بہت پسند تھے۔ ان کے نیاز مند اور دوست دور دور سے قسم قسم کے آم تحفۃً بھیجتے اور ہم نیاز مندوں کو موسم میں کئی بار کھانے کا موقع ملتا۔ میاں نظام الدین مرحوم رئیس اعظم لاہور موسم میں بعض اوقات دو تین بار یا کم از کم ایک بار حضرت کو بعض نیاز مندوں سمیت اپنے باغ میں لے جاتے۔ قسم قسم کے آموں سے چوبچے بھروا دیتے۔ اور کئی کئی گھنٹے انبہ خوری کا سلسلہ جاری رہتا۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ قدرت نے میووں کو ترقی دیتے ہوئے انگور بنائے۔ انگوروں میں جو کمی رہ گئی تھی وہ آموں کی تخلیق سے پوری کر دی۔ بعض اوقات فرماتے کہ میوے صرف چند ہیں اکثر میووں کی حیثیت وہی ہے۔ جیسے ہندوؤں میں "اچھوتوں" کی ہے۔

(رحیم بخش شاہین، اوراقِ گم گشتہ، اسلامک پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۳۸۸)

○

کھانے کی کیفیت

ان کی عادت برسوں سے یہ ہوگئی تھی کہ صرف دوپہر کے وقت کھانا تناول فرماتے۔ رات کے وقت یا تو تھوڑا سا دلیہ دودھ ڈال کر کھالیتے یا بالکل کچھ نہ کھاتے۔ سردیوں کے موسم میں رات کے نو بجے کے قریب دو بسکٹ کھاتے اور نمکین کشمیری چائے پیتے۔

وفات سے کئی برس پیشتر درد گردہ کا ایک سخت حملہ ہوا تھا جو کئی دن تک جاری رہا۔ اس زمانے میں خواجہ حسن نظامی کے مشورے کے مطابق حکیم عبدالوہاب مرحوم عرف نابینا حکیم صاحب کا علاج کرایا جس سے بڑا فائدہ ہوا۔ اس کے بعد جب بھی کوئی تکلیف محسوس ہوتی تو حکیم صاحب کو کیفیت لکھ بھیجتے اور دہلی سے دوا آجاتی۔ کھانا بہت کم مقدار میں کھاتے۔ پلاؤ اور سیخ کے کباب بہت مرغوب تھے۔ اگر دو چار روز متواتر سیخ کے کباب کھالیتے تو تکلیف ہو جاتی۔

(رحیم بخش شاہین، اوراق گم گشتہ، اسلامک پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۵، ص ۳۸۸)

○

ایک تحریر

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کا بیان ہے کہ جب ''بانگ درا'' پہلی بار چھپی تو علامہ اقبال نے ایک جلد چودھری محمد حسین صاحب ایم اے کو تحفۃً دی۔ اس کے سرورق پر علامہ اقبال کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک شعر ہے جو آپ کے علامہ سے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔

(رحیم بخش شاہین، اوراق گم گشتہ، اسلامک پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۵، ص ۱۰۶)

○

قرآن کا احترام

میں نے متعدد مرتبہ قرآن مجید کو ان کے مطالعے کو میز پر دیگر کتابوں کے ساتھ پڑا دیکھا۔ ایک مرتبہ میں نے ادب کے ساتھ انہیں اس طرف متوجہ کیا تو فرمانے لگے" یہ کسی قیمتی اور خوبصورت غلاف میں لپیٹ کر اور عطر میں بسا کر اونچی جگہ پر رکھنے والی کتاب نہیں بل کہ یہ تو انسان کے ہر وقت کام آنے والی کتاب ہے۔ چوں کہ مجھے اکثر اس کے حوالے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے یہاں رکھی ہے۔" اس پر مجھے معلوم ہوا کہ علامہ کی نگاہ میں قرآن مجید کی عظمت اور تقدس کا سبب اور معیار کیا تھا۔

(رحیم بخش شاہین، اوراق گم گشتہ، اسلامک پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۱۳۶)

○

گوشہ نشینی

باہر نکلنے کے زیادہ عادی نہ تھے لیکن جب تک آواز نہیں بیٹھی تھی۔ ہائیکورٹ میں مقدمات کی پیروی کے لیے چلے جاتے تھے جس روز کوئی پیشی نہ ہوتی عموماً نہ جاتے۔ آواز کی تکلیف شروع ہو جانے کے بعد ہائی کورٹ جانا بھی بند ہو گیا۔ میرے علم کے مطابق آخری مرتبہ وہ اس وقت گھر سے باہر نکلے تھے جب فرمانروائے بہاول پور لاہور آئے تھے اور انھوں نے دارالاقامہ کے قیام کے سلسلے میں مشورے کے لیے حضرت مرحوم کو بلایا تھا۔ یہ غالباً انتقال سے تین چار مہینے پیشتر کا واقعہ ہے۔

(رحیم بخش شاہین، اوراق گم گشتہ، اسلامک پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۳۸۹)

○

کرایہ مکان کی ادائیگی

ایک عجیب اتفاق ملاحظہ ہو کہ حضرت مرحوم کی کوٹھی صاحبزادہ جاوید اقبال کے نام پر بنی تھی۔ اور اسی کی ملکیت تھی۔ اقبال اس کے صرف تین کمرے استعمال فرماتے تھے۔ خواب گاہ، ڈرائنگ روم، اور ڈریسنگ روم۔ ان تین کمروں کے لیے پچاس روپے ماہانہ کرایہ پیشگی ہر مہینے کی ۲۱ تاریخ کو بنک میں جاوید کے نام جمع کرا دیتے تھے۔ ۲۱ اپریل کی صبح کو ان کا انتقال ہوا یہ دن ۲۱ مارچ کو ادا کیے ہوئے کرائے کا آخری دن تھا۔

(رحیم بخش شاہین، اوراق گم گشتہ، اسلامک پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۵ء ص ۳۹۷)

○

نوجوان مبلغ اور مسلم خاتون

معاشرتی اصلاح کے نوجوان مبلغ یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی تعلیم کے چند جرعے مسلم خاتون کے تن مردہ میں نئی جان ڈال دیں گے اور وہ اپنی ردائے کہنہ کو پارہ پارہ کر دے گی۔ شاید یہ بات درست ہو۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اپنے آپ کو برہنہ پا کر اسے ایک مرتبہ پھر اپنا جسم ان نوجوان مبلغوں کی نگاہوں سے چھپانا پڑے گا۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۸)

○

مصیبت کی اخلاقی قدر

کوئی مذہبی نظام، مصیبت کی اخلاقی قدر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ عیسائیت کے بانیوں کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے صرف مصیبت کی حقیقت پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھی اور دیگر عوامل کی اخلاقی قدر کو فراموش کر بیٹھے۔ تاہم، حسین لیکن یک رخے یونانی نصب العین کی کمی پوری کرنے کے لیے یورپی ذہن کو ایسے ہی مذہبی نظام کی ضرورت تھی۔ یونانی تصور حیات، بقول گوئٹے، بہترین تھا، لیکن مصیبت کی رنگ آمیزی سے عاری تھا، جس کی تلافی عیسائیت سے ہوگئی۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۴۳)

○

مابعد الطبیعیات پر سائنس کا انحصار

جدید سائنس کو مابعد الطبیعیات پر خندہ زن نہ ہونا چاہیے، کیونکہ وہ لیبنز جیسا ماہر مابعد الطبیعیات ہی تھا جس نے سب سے پہلے سائنس کو مادے کا عملی تصور بخشا۔ اس کا قول ہے کہ "مادہ اصلاً قوت مذاحمت ہے" مابعد الطبیعیات سے یہ تصور مستعار لے کر سائنس نے اس "قوت" کے رویے کے مطالعے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ ظاہر ہے کہ سائنس اسے بذات خود دریافت نہ کر پاتی۔

(ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۰۹)

○

مکتوباتِ اقبال

قائداعظم محمد علی جناحؒ کے نام

اقبال کے خطوط جناح کے نام

پہلا خط: محررہ	۲۳ مئی ۱۹۳۶ء	دوسرا خط: محررہ	۹ جون ۱۹۳۶ء
تیسرا خط: محررہ	۲۵ جون ۱۹۳۶ء	چوتھا خط: محررہ	۲۳ اگست ۱۹۳۶ء
پانچواں خط: محررہ	۸ دسمبر ۱۹۳۶ء	چھٹا خط: محررہ	۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء
ساتواں خط: محررہ	۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء	آٹھواں خط: محررہ	۲۸ مئی ۱۹۳۷ء
نواں خط: محررہ	۲۱ جون ۱۹۳۷ء	دسواں خط: محررہ	۱۱راگست ۱۹۳۷ء
گیارہواں خط: محررہ	۱۳راگست ۱۹۳۷ء	بارہواں خط: محررہ	۷راکتوبر ۱۹۳۷
تیرہواں خط: محررہ	۳۰راکتوبر ۱۹۳۷ء	چودہواں خط: محررہ	یکم نومبر ۱۹۳۷ء
پندرھواں خط: محررہ	۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء		

''خط'' پیغام رسانی کا بہترین ذریعہ ہے۔ زمانہ قدیم میں خطوط کی وجہ سے روابط قائم دائم رہتے تھے۔ مقصودِ کائنات، سرورِ کائنات، فخرِ کائنات، رونقِ کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ نے پیغام اسلام کی اشاعت کے لیے خطوط کا سہارا لیا۔ متعدد سربراہوں کو خطوط لکھ کر قبولِ اسلام کی دعوت دی۔ دانائے سبل ختم الرسل محمد مصطفیٰ ﷺ کے بعد بھی مسلمان حکمرانوں نے خطوط کے ذریعے دنیا بھر میں روابط کا جال پھیلایا۔ آج اردو ادب میں خطوط نویسی ایک صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

خط کو ''نصف ملاقات'' بھی کہتے ہیں۔ علمی، ادبی، ثقافتی تعزیتی تقریبات کے انعقاد کے سلسلہ میں لکھے جانے والے خطوط کو عموماً رسمی اور دعوتی خطوط کہا جاتا ہے۔ ان خطوط میں عمومی جملوں کے ساتھ دوست، احباب اور عزیز و اقارب کو مدعو کیا جاتا ہے۔ صنف نثر میں ادبی اور علمی خطوط بڑی

اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ خطوط سے جہاں حالات وواقعات کا پتہ چلتا ہے وہاں مکتوب نگار کی ذہنی، قلبی کیفیات، نفسیاتی وجذباتی احساسات، میلانات اور رجحانات کے علاوہ اس کی پسند ناپسند حتیٰ کہ عادات وخصائل کے بارے میں بھی آگاہی ملتی ہے۔ خطوط کے ذریعے کسی بھی دور کے معاشی، معاشرتی، سیاسی، اور سماجی رجحانات کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ مکتوب نگار کے ذہنی اپج کو جاننے کے لیے اس کے خطوط سے بہت کچھ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ اگر مکتوب نگار شاعر یا ادیب ہے تو وہ خط میں اپنے فکر وفلسفہ کی توضیحات وتشریحات کا اظہار کرے گا۔ خطوط کے ابتدائی نمونوں کو دیکھیں تو ان میں بڑے لمبے چوڑے القابات، بناوٹ اور ثقیل الفاظ سے مزین ہوتے تھے۔ اسد اللہ خان غالب کے دور میں آتے آتے خطوط میں القابات کو سرے سے ختم کر دیا گیا رہی اور بناوٹی تزئین وآرائش کو بھی ترک کر دیا گیا۔ گفت گو کے انداز میں خطوط لکھے جانے لگے جن میں القابات کا بھی خیال نہ رکھا جانے لگا۔ غالب کے خطوط پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے روبرو بیٹھ کر گفت گو کی جارہی ہو۔ سرسید احمد خان کی خطوط نگاری نے بھی خاصا متاثر کیا۔ یہ روایت بہت سے شاعروں، ادیبوں میں سرایت کر گئی۔ دھیرے دھیرے خطوط نویسی نے ایک صنف کا درجہ حاصل کر لیا۔

شاعروں اور ادیبوں کے ہاں بھی خطوط کا لاتعداد مقامات پر تذکرہ ملتا ہے۔ کہیں چٹھی سیاں جی کے نام، تو کہیں قاصد کے ہاتھ خط بھیج کر حال دل بیان کرنے کی روایات اردو شاعری میں ملتی ہیں۔

پڑھ تو چکا ہوں لیکن انہیں کیسے پھینک دوں
خوشبو تمہارے ہاتھ کی ان کاغذوں میں ہے

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے" تو چھپائے نہ بنے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو گر نامہ بر ملے

خصوصاً عظیم رہنماؤں کے خطوط افراد کی اقلیم زندگی میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں اور سلطنتوں کے دھارے موڑ دیتے ہیں۔ شیخ احمد سرہندی نے نہ صرف اپنی تنظیمی و تقریری صلاحیتوں سے تجدید دین کی بلکہ ان کی تحریروں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے زیادہ تر تحریریں ان کے مکتوبات ہیں جو کہ تین دفاتر پر مشتمل ہیں اور "مکتوبات امام ربانی" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ اجاگر کرنے کے لیے مسلم اکابر نے بھی خطوط کا سہارا لیا۔ اردو کے عناصر خمسہ سر سید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولانا الطاف حسین، مولانا محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی نے بھی خطوط کی بدولت رابطہ ہم تیز رکھی۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کی ہمہ صفت شخصیت نے کسی کو مایوس نہیں کیا۔ وہ خط کا جواب دینے میں وسیع القلم ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی خطوط نویسی پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ سانحہ جلیانوالہ باغ (۱۹۱۹ء)، اور تحریک خلافت (۱۹۲۲) کے بعد برعظیم پاک و ہند میں سیاسی بیداری کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے لیجسلیٹو کونسل کا الیکشن جیت لیا۔ ۱۹۲۸ء میں جواہر لال نہرو نے برعظیم پاک و ہند کے مسائل کا حل ایک رپورٹ میں پیش کیا تو ۱۹۲۹ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے چودہ نکات پیش کر کے اس رپورٹ کو رد کر دیا۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ اور خود مختار مملکت کے قیام کا خاکہ پیش کیا۔ لندن میں گول میز کانفرنسوں کے انعقاد اور

۱۹۳۵ء کے انڈین نیشنل ایکٹ کے بعد ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی سیاسی بصیرت نے محسوس کیا کہ قائد اعظم محمد علی جناح واحد شخصیت ہیں جو مسلمانوں کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو سہارا دے سکتے ہیں۔ یہ خطوط تحریر کرنے کا دورانیہ ہر چند کہ مختصر ہے لیکن تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ خطوط کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

پہلا خط ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء...... دوسرا ۹ جون ۱۹۳۶ء...... تیسرا ۲۵ جون ۱۹۳۶ء...... چوتھا ۲۳ راگست ۱۹۳۶ء...... پانچواں ۸ دسمبر ۱۹۳۶ء...... چھٹا ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء...... ساتواں ۲۲ راپریل ۱۹۳۷ء...... آٹھواں ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء...... نواں ۲۱ جون ۱۹۳۷ء...... دسواں ۱۱ راگست ۱۹۳۷ء...... گیارہواں ۱۳ راگست ۱۹۳۷ء...... بارہواں ۷ راکتوبر ۱۹۳۷ء...... تیرہواں ۳۰ راکتوبر ۱۹۳۷ء...... چودھواں یکم نومبر ۱۹۳۷ء...... پندرہواں ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء

اسی طرح علامہ اقبال کے وہ خطوط جو انھوں نے قائد اعظم محمد علی جناح" کو لکھے تحریک پاکستان میں ایک اہم کردار رکھتے ہیں۔ یہ خطوط نہ صرف اقبالیات کا بیش قیمت سرمایہ ہیں بلکہ تحریک پاکستان اور اس کے پس منظر کی عظیم دستاویز بھی ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے ہمیں پتا چلتا ہے کہ محمد علی جناح ہی مسلمانوں کو آزادی کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔ اقبال کے پر خلوص لفظوں نے محمد علی جناح کو مجبور کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کو منزل مراد تک پہنچائیں۔ قائد اعظم کی ولولہ قیادت انگیز نے اقبال کے لفظوں کو عملی جامہ پہنایا۔ اقبال خود تو پاکستان بنتے نہ دیکھ سکے لیکن آج پوری قوم اقبال کو مصور پاکستان کے حوالے سے یاد کرتی ہے۔ یہ وہ خطوط ہیں جن کی بدولت پاکستان کی بنیادیں استوار ہوئیں۔ اس لیے ان خطوط کا ہر لفظ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

یہ خطوط انگریزی زبان میں تھے جنھیں محمد شریف طوسی نے کمال محنت سے نہ صرف اکٹھا کیا بلکہ زیور طباعت سے آراستہ بھی کیا۔ پہلی مرتبہ یہ خطوط قائد اعظم محمد جناح کے پیش لفظ سے شائع ہوئے۔ ان کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر محمد جہانگیر عالم نے ان خطوط کو اردو سانچے میں ڈھالا۔ یہ خطوط کتابی شکل میں منظر عام پر آنے سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ مصور پاکستان ڈاکٹر علامہ

اقبال نے کس طرح محمد علی جناح کی شخصی عظمت اور ان کی صلاحیتوں کا ادراک کر لیا۔

انھوں نے تاریخی اہمیت کے حامل خطوط کو شامل کیا ہے تاریخی اہمیت اس لیے کہ یہ خطوط ایک عظیم مفکر، دانشور، شاعر، حکیم الامت اور امت مسلمہ کے مفسر کے تحریر کردہ ہیں۔ ابتدائیہ جہانگیر عالم نے جب کہ پیش لفظ ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی نے لکھا ہے۔ تعارف میں مطلوب الحسن سید کے انگریزی مضمون "محمد علی جناح ...... ایک سیاسی مطالعہ" کا کچھ حصہ شامل ہے۔ ان خطوط کی اشاعت کی کہانی اقبال کے خطوط جناح کے نام" چودہ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے پیش لفظ (قائداعظم محمد علی جناح) کی یہ سطور قابل توجہ ہیں:

> "یہ کتابچہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو اسلام کے قومی شاعر، فلسفی اور عارف ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے میرے نام مئی ۱۹۳۲ء سے نومبر ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصہ میں اپنی وفات سے کچھ ماہ پہلے تحریر کیے۔ یہ دور جون ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے قیام اور اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ کے تاریخی اجلاس کے دوران تک محیط ہے۔ مسلم ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔"

یہ خطوط اقبال اکادمی نے اقبال کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ۱۹۷۷ء میں شائع کیے تھے۔ جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔ ناظم اقبال اکادمی محمد سہیل عمر کی زیر سرپرستی ۲۰۰۲ء میں ان خطوط کا اکادمی ایڈیشن خوبصورت شکل میں سامنے آیا۔ جس میں صفحات کی تعداد ۹۶ ہے۔ جب کہ اس ایڈیشن کی قیمت بھی ۷۰ روپے کر دی گئی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر افتخار احمد چشتی، ڈاکٹر محمد صدیق شبلی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، اور مختلف رسائل و جرائد کی آراء بھی شامل کی گئی ہیں۔ کتاب کا انتساب سابق وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر منیر الدین چغتائی کے نام ہے۔ اس کتاب میں پندرہ خطوط شامل ہیں۔ اقبالیات اور تحریک پاکستان کے شائقین کے لیے ان کا

مطالعہ بڑا دلچسپ اور اہم ہے کیوں کہ ان سے نہ صرف علامہ اقبال اور قائداعظم کے درمیان گہرے تعلقات اور فکری ہم آہنگی کا اندازہ ہوتا ہے بل کہ نظریہ پاکستان کے بنیادی خدوخال بھی سامنے آتے ہیں۔ محمد جہانگیر عالم نے نہ صرف اردو ترجمہ کیا ہے بل کہ بعض نئے خطوط بھی دریافت کر کے اس کتاب کی زینت بنا دیے ہیں۔ مثلاً اس کتاب میں موجود پانچواں اور گیارھواں خط پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔ اس کے علاوہ تین ایسے خطوط بھی شامل ہیں جو انھی دنوں علامہ اقبال کی طرف سے غلام رسول خان بارا یٹ لاء سیکرٹری پنجاب مسلم لیگ نے قائداعظم محمد علی جناح کو لکھے تھے۔ ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”محمد جہانگیر عالم صاحب نے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے نصاب اقبالیات کے لیے بھی بہت معیاری کام کیا ہے۔ اس کام کا تعلق بھی زیادہ تر انھی خطوط سے ہے کسی ایک محقق نے ان خطوط کو اس طرح اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنایا۔ وہ گذشتہ کئی سالوں سے ان پر تحقیق کر رہے ہیں۔ اس تحقیق و تلاش کے نتیجے میں وہ قائداعظم محمد علی جناح کے نام علامہ اقبال کے دو اور خط دریافت کرنے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں اور اب پندرہ مکتوبات کا مجموعہ اردو میں ان کی کوشش سے پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ امید ہے اہل نظر محمد جہانگیر عالم کے اس کارنامے کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔“

اِن خطوط میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے اُسلوب کا بھی پتا چلتا ہے۔ لفظوں میں روانی، لفظوں کا حسنِ انتخاب، اور حالات حاضرہ کی خصوصی زبان ان خطوط کا طرۂ امتیاز ہے۔ ذاتی زندگی سے لے کر برعظیم پاک و ہند کے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات و احساسات اِن خطوط میں نمایاں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی بصیرت کا پتا چلتا ہے کہ اُنھوں نے برعظیم کے مسلمانوں کے لیے محمد علی جناح کا انتخاب کیا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے برعظیم پاک و ہند کی صورت حال کو جس انداز سے قائداعظم

محمد علی جناح کو آگاہ کیا وہ واقعی تاریخی ہے۔ غیر جانب دارانہ تبصروں کے ساتھ انھوں نے محمد علی جناح کو برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی قیادت پر رضامند کیا۔ اقبال اپنا خواب شرمندہ تعبیر ہوتے تو نہ دیکھ سکے لیکن زمانہ آج بھی اقبال کو مانتا ہے کہ اِن کی وجہ سے مسلمانوں کو ایک سائبان محبت اور مسیحا قائداعظم کے روپ میں ملا۔

لاہور

۹ جون ۱۹۳۶ء

محترم جناح صاحب

میں اپنا مسودہ ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ کل کے ایسٹرن ٹائمز کا ایک تراشہ بھی ہمراہ ہے، یہ گورداس پور کے ایک قابل وکیل کا خط ہے۔

مجھے امید ہے کہ بورڈ کی طرف سے جاری شدہ بیان میں تمام سکیم کی پوری تفصیل ہوگی، اور سکیم پر اب تک کیے گئے اعتراضات کا شافی جواب بھی ہوگا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ حیثیت کا ہندوؤں اور حکومت دونوں سے متعلق اس میں برملا اور واضح ذکر ہونا چاہیے۔ اس بیان میں یہ انتباہ بھی ہو کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے موجود سکیم کو اختیار نہ کیا تو نہ صرف یہ کہ جو کچھ گزشتہ پندرہ برسوں میں انھوں نے حاصل کیا ہے ضائع کر بیٹھیں گے بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے قومی شیرازے کو پارہ پارہ کر کے اپنے ہی نقصان کا باعث ہوں گے۔

آپ کا

محمد اقبال

"مکرر آنکہ: میں نہایت ممنون ہوں گا کہ اگر اخبارات کو روانہ کرنے سے قبل آپ یہ بیان مجھے بھی ارسال کر دیں۔

"دوسری بات جس کا ذکر اس بیان میں ہونا چاہیے یہ ہے:

(۱) مرکزی اسمبلی کے لیے بالواسطہ طریق انتخاب نے یہ قطعی طور پر ضروری کر دیا ہے کہ جو اراکین صوبائی اسمبلیوں کے لیے منتخب کیے جائیں وہ ایک کل ہند مسلم پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں تاکہ وہ مرکزی اسمبلی میں ایسے مسلمان نمائندے منتخب کریں جو اس بات کا عہد کریں کہ مرکزی اسمبلی میں مسلم ہندوستان کے ان مخصوص مرکزی مسائل کی تائید وحمایت کریں گے جو ہندوستان کی دوسری بڑی قوم کی حیثیت سے مسلمانوں سے متعلق ہوں۔ جو لوگ اس وقت صوبائی پالیسی اور پروگرام کے حامی ہیں، وہی لوگ مرکزی اسمبلی کے لیے بالواسطہ طریق انتخاب کو دستور میں شامل کروانے کے ذمہ دار ہیں۔ بلاشبہ ایک غیر ملکی حکومت کا مفاد اسی میں ہے۔ اب جب کہ قوم اس مصیبت (بالواسطہ انتخاب) سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی ہے اور اس نے انتخاب کے لیے ایک کل ہند سکیم (یعنی مسلم لیگ کی سکیم) تیار کر لی ہے جس کی پابندی تمام صوبائی امیدوار کریں گے، تو وہی لوگ پھر غیر ملکی حکومت کے اشارے پر مصروف عمل ہیں کہ قوم کو اپنی شیرازہ بندی کی کوششوں میں ناکام کریں"

۲۔ "اسلامی اوقاف کا قانون جیسا کہ شہید گنج سے ظاہر ہوا، اور اسلامی ثقافت، زبان، مساجد اور قانون شریعت سے متعلق مسائل پر بھی بیان میں توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔"

(نوٹ: علامہ کے خط میں "سکیم" کا لفظ کئی بار آیا ہے اس سے مراد آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی بورڈ کا منشور ہے جو مسلمانوں کی آئندہ سرگرمیوں کا مرکز رہا)

لاہور

۲۵ جون ۱۹۳۶ء

محترم جناح صاحب

سر سکندر حیات دو ایک روز ہوئے لاہور سے روانہ ہو چکے ہیں میرے خیال میں وہ بمبئی میں آپ سے مل کر بعض اہم امور پر گفت گو کریں گے۔ کل شام دولتانہ مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ ان کا کہنا تھا کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان اراکین مندرجہ ذیل اعلان کرنے کے لیے تیار ہیں۔

”کہ ان تمام امور میں جو مسلمانوں سے بحیثیت ایک کل ہند اقلیت سے متعلق ہیں وہ مسلم لیگ کے فیصلے کے پابند ہوں گے اور صوبائی اسمبلی میں کسی غیر مسلم جماعت کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کریں گے۔

بشرطیکہ (صوبائی) مسلم لیگ بھی حسب ذیل اعلان کرے کہ:

وہ اراکین اسمبلی جو مسلم لیگ۔ ..ٹکٹ پر کامیاب ہو کر صوبائی اسمبلی میں آئیں گے وہ صرف اس جماعت یا فریق کے ساتھ تعاون کریں گے جس میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو گی۔

از راہ کرم اپنی اولین فرصت میں مطلع فرمایئے کہ اس تجویز کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ سر سکندر حیات سے جو گفت گو ہو اس کے نتیجہ سے بھی مطلع فرمایئے۔ اگر آپ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کا ہمارے ساتھ شامل ہو جانا کچھ بعید نہیں۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

۵

لاہور

۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

میرا خیال ہے کہ آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ خطبہ جو انھوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں دیا ہے، پڑھا ہوگا اور اس کے بین السطور جو پالیسی کار فرما ہے اس کو آپ نے بخوبی محسوس کر لیا ہوگا۔ جہاں تک اس کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں سے ہے، میں سمجھتا ہوں آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ نئے دستور نے ہندوستان کے مسلمانوں کو کم از کم اس بات کا ایک نادر موقع دیا ہے کہ وہ ہندوستان اور مسلم ایشیا کی آئندہ سیاسی ترقی کے پیش نظر اپنی قومی تنظیم کر سکیں۔ اگرچہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہیں، تاہم ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت حد تک ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر ہے۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک موثر جواب دیا جائے۔ آپ جلد از جلد دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں، جس میں شرکت کے لیے نئی صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے علاوہ دوسرے مقتدر مسلم رہنماؤں کو بھی مدعو کریں۔ اس کنونشن میں پوری قوت اور قطعی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیں کہ سیاسی مطمع نظر کی حیثیت سے مسلمانان ہند ملک میں جداگانہ سیاسی وجود رکھتے ہیں۔ یہ انتہائی ضروری ہے کہ اندرون اور بیرون ہند کی دنیا کو بتا دیا جائے کہ ملک میں صرف اقتصادی مسئلہ ہی تنہا ایک مسئلہ نہیں ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے ثقافتی مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اپنے اندر زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے اور کسی صورت سے بھی یہ اقتصادی مسئلہ سے کم اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ اگر آپ ایسا کنونشن منعقد کر سکیں تو پھر ایسے مسلم اراکین اسمبلی کی حیثیتوں کا امتحان ہو جائے گا جنھوں نے مسلمانان ہند کی

امنگوں اور مقاصد کے خلاف جماعتیں قائم کر رکھی ہیں، مزید برآں اس سے ہندوؤں پر یہ عیاں ہو جائے گا کہ کوئی سیاسی حربہ خواہ کیسا ہی عیارانہ کیوں نہ ہو پھر بھی مسلمانان ہند اپنے ثقافتی وجود کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ میں چند روز تک دہلی آ رہا ہوں۔ اس مسئلہ پر آپ سے گفت گو ہوگی۔ میرا قیام افغانی سفارت خانہ میں ہوگا۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو وہیں ہماری ملاقات ہونی چاہیے۔ از راہ کرم اس خط کے جواب میں چند سطور جلد از جلد تحریر فرمائیے۔

آپ کا مخلص

اقبال بار ایٹ لاء

○

لاہور

۲۲ر اپریل ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

دو ہفتے ہوئے میں نے آپ کو خط لکھا تھا، معلوم نہیں وہ آپ کو ملا یا نہیں۔ میں نے وہ خط آپ کو دہلی کے پتہ پر لکھا تھا اور پھر جب میں دہلی گیا تو معلوم ہوا کہ آپ وہاں سے پہلے ہی رخصت ہو چکے ہیں۔ میں نے اس خط میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں فوراً ایک آل انڈیا مسلم کنونشن (کسی بھی مقام پر) مثلاً دہلی میں منعقد کر کے حکومت اور ہندوؤں کو ایک بار پھر مسلمانان ہند کی پالیسی سے آگاہ کر دینا چاہیے۔

چوں کہ صورت حال نازک ہوتی جا رہی ہے اور پنجاب کے مسلمانوں کا رجحان بعض ایسے وجوہ کی بنا پر جن کی تفصیل بتانا (اس وقت) غیر ضروری ہے، کانگریس کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس معاملہ پر فوری غور فرما کر فیصلہ کریں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس

اگست تک ملتوی ہو چکا ہے، لیکن حالات کا تقاضا ہے کہ فوری طور پر مسلم پالیسی کا اعلان مکرر ہو۔ اگر کنونشن کے انعقاد سے پہلے مقتدر مسلمان لیڈروں کا ایک دورہ بھی ہو جائے تو کنونشن یقیناً بہت کامیاب رہے گا براہ نوازش اس خط کا جواب اپنی اولین فرصت میں عنایت فرمایئے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

یار ایٹ لاء

○

لاہور

۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

آپ کے نوازش نامہ کا شکریہ جو مجھے اس اثنا میں ملا۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ مسلم لیگ کے دستور اور پروگرام میں جن تبدیلیوں کے متعلق میں نے تحریر کیا تھا وہ آپ کے پیش نظر رہیں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانان ہند کی نازک صورت حال کا آپ کو پورا پورا احساس ہے۔ مسلم لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی ایک جماعت بنی رہے گی یا مسلم جمہور کی جنہوں نے اب تک بعض معقول وجوہ کی بنا پر اس (مسلم لیگ) میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ کوئی سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی حالت سدھارنے کی ضامن نہ ہو، ہمارے عوام کے لیے باعث کشش نہیں ہو سکتی۔

" نئے دستور کے تحت اعلیٰ ملازمتیں تو بالائی طبقوں کے بچوں کے لیے مختص ہیں، اور ادنیٰ ملازمتیں وزراء کے اعزا اور احباب کی نذر ہو جاتی ہیں، دیگر امور میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے

مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی طرف کبھی غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز نازک ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو سو سال سے وہ برابر تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ اس غربت کی وجہ ہندو کی ساہوکاری (سود خوری) اور سرمایہ داری ہے۔ یہ احساس کہ اس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی شریک ہے ابھی پوری طرح نہیں ابھرا، لیکن آخر کو ایسا ہو کر رہے گا۔ جواہر لال نہرو کی بے دین اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا علاج کیا ہے۔؟ مسلم لیگ کا سارا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے۔؟ اگر مسلم لیگ نے (اس ضمن میں) کوئی وعدہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ مسلم عوام پہلے کی طرح اس سے بے تعلق رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس کا حل موجود ہے اور موجود نظریات کی روشنی میں (اس میں) مزید ترقی کا امکان ہے۔ اسلامی قانون کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لیے کم از کم حق معاش محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن شریعت اسلام کا نفاذ اور ارتقاء ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کے بغیر اس ملک میں ناممکن ہے۔ سالہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور اب بھی میرا ایمان ہے کہ مسلمانوں کی غربت (روٹی کا مسئلہ) اور ہندوستان میں امن و امان کا قیام اسی سے حل ہو سکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں یہ ممکن نہیں ہے تو پھر دوسرا متبادل (راستہ) صرف خانہ جنگی ہے جو فی الحقیقت ہندو مسلم فسادات کی شکل میں کچھ عرصہ سے جاری ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں مثلاً شمال مغربی ہندوستان میں فلسطین (کی داستان) دہرائی جائے گی۔ جواہر لال نہرو کی اشتراکیت کا ہندوؤں کی ہیئت سیاسیہ کے ساتھ پیوند بھی خود ہندوؤں کے آپس میں خون خرابہ کا باعث ہوگا۔ اشتراکی جمہوریت اور برہمنیت کے درمیان وجہ نزاع برہمنیت اور بدھ مت کے درمیان وجہ نزاع سے مختلف نہیں ہے۔ آیا اشتراکیت کا حشر ہندوستان میں بدھ مت کا سا ہوگا یا نہیں؟ میں اس بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا لیکن میرے ذہن میں یہ بات صاف ہے کہ اگر ہندو دھرم اشتراکی کی

جمہوریت اختیار کر لیتا ہے تو خود ہندو دھرم ختم ہو جاتا ہے۔ اسلام کے لیے اشترا کی جمہوریت کو مناسب تبدیلیوں اور اسلام کے اصول شریعت کے ساتھ اختیار کر لینا کوئی انقلاب نہیں، بل کہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع ہوگا۔ موجودہ مسائل کا حل مسلمانوں کے لیے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے، لیکن جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے، مسلم ہندوستان کے ان مسائل کا حل آسان طور پر کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کو ایک یا ایک سے زیادہ مسلم ریاستوں میں تقسیم کیا جائے جہاں پر مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبہ کا وقت نہیں آ پہنچا؟ شاید جواہر لال کی بے دین اشترا کیت کا آپ کے پاس یہ ایک بہترین جواب ہے۔

بہر حال میں نے اپنے خیالات پیش کر دیے ہیں اس امید پر کہ آپ اپنے خطبہ مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس کے مباحث میں ان پر سنجیدگی سے توجہ دیں گے۔ مسلم ہندوستان کو امید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی فراست موجودہ مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

○

لاہور

۲۱ جون ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

کل آپ کا نوازش نامہ ملا۔ بہت بہت شکریہ! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں مگر مجھے توقع ہے کہ میرے بار بار خط لکھنے کو آپ بار خاطر نہ خیال کریں گے۔ اس وقت جو طوفان

شمال مغربی ہندوستان اور شاید پورے ہندوستان میں برپا ہونے والا ہے، اس میں صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے قوم محفوظ رہنمائی کی توقع کا حق رکھتی ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہم فی الحقیقت خانہ جنگی کی حالت ہی میں ہیں اگر فوج اور پولیس نہ ہو تو یہ (خانہ جنگی) دیکھتے ہی دیکھتے پھیل جائے۔ گذشتہ چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ صرف شمال مغربی ہندوستان میں گزشتہ تین ماہ میں کم از کم تین (فرقہ وارانہ) فسادات ہو چکے ہیں اور کم از کم چار وارداتیں ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہین رسالت کی ہو چکی ہیں۔ ان چاروں مواقع پر رسول ﷺ کی اہانت کرنے والوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ سندھ میں قرآن مجید کو نذر آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔ میں نے تمام صورت حال کا اچھی طرح سے جائزہ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان حالات کے اسباب نہ مذہبی ہیں اور نہ اقتصادی، بل کہ خاص سیاسی ہیں۔ یعنی مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کرنا ہے۔ نیا دستور کچھ اس قسم کا ہے کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم وزارتیں کوئی مناسب کارروائی نہیں کر سکتیں بل کہ انھیں خود مسلمانوں سے ناانصافی برتنا پڑتی ہے تا کہ وہ لوگ جن پر وزارات کا انحصار ہے خوش رہ سکیں، اور ظاہر کیا جا سکے کہ وزرات قطعی طور پر غیر جانبدار ہے۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ ہمارے پاس اس دستور کو دور کرنے کے لیے خاص وجوہ موجود ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیا دستور ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کو قطعی اکثریت حاصل ہے اور وہ مسلمانوں کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو کاملاً ہندوؤں پر انحصار کرنے کے لیے مجبور کر دیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ یہ دستور ہندوستانی مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اقتصادی مسئلہ کا بھی حل نہیں ہے جو مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ جان کا وبن چکا ہے۔

''کمیونل ایوارڈ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی وجود کو صرف تسلیم کرتا ہے، لیکن کسی قوم

کے سیاسی وجود کا ایسا اعتراف جو اس کی اقتصادی پسماندگی کا کوئی حل تجویز نہ کرتا ہو اور نہ کر سکے اس کے لیے بے سود ہے، کانگریس کے صدر نے تو غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کے جداگانہ سیاسی وجود سے ہی انکار کر دیا ہے۔ ہندوؤں کی دوسری سیاسی جماعت یعنی مہاسبھا نے جسے میں ہندو عوام کی حقیقی نمائندہ سمجھتا ہوں بارہا اعلان کیا ہے کہ ہندوستان میں قیام امن کے لیے ملک کی از سر نو تقسیم کی جائے۔ جس کی بنیاد نسلی مذہبی اور لسانی اشتراک پر ہو۔ بہت سے برطانوی مدبرین بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ اس دستور کے جلو میں جو ہندو مسلم فسادات چلے آ رہے ہیں وہ ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں کہ ملک کی حقیقی صورت حال کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے روانگی سے قبل لارڈ لوتھیان نے مجھے کہا کہ میری سکیم میں ہندوستان کے مصائب کا واحد ممکن حل ہے لیکن اس پر عمل در آمد کے لیے ۲۵ سال درکار ہیں۔ پنجاب کے کچھ مسلمان شمال مغربی ہندوستان میں مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کر رہے ہیں اور یہ تجویز تیزی سے مقبولیت اختیار کر رہی ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ ہماری قوم ابھی اتنی زیادہ منظم نہیں ہوئی اور نہ ہی ان میں اتنا نظم و ضبط ہے اور شاید ایسی کانفرنس کے انعقاد کا ابھی موزوں وقت بھی نہیں۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریق عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر اختیار کرنا پڑے گا۔

میرے خیال میں تو نئے دستور میں ہندوستان بھر کو ایک ہی وفاق میں مربوط رکھنے کی تجویز بالکل بے کار ہے۔ مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق کا قیام اس طریق پر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے صرف واحد راستہ ہے۔ جس سے ہندوستان میں امن و امان قائم ہوگا اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے بچایا جا سکے گا کیوں نہ شمال اور مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو علیحدہ اقوام تصور کیا جائے جنھیں ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دوسری اقوام کی طرح حق خود اختیاری حاصل ہو۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اسی

طریق کو اختیار کرنے میں ہے۔ اس لیے مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبہ کی بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہوگا۔ لاہور میں اگست کا مہینہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ لاہور میں وسط اکتوبر میں جب موسم خوش گوار ہو جاتا ہے، مسلم لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے بارے میں غور فرمائیں۔ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ سے دلچسپی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور لاہور میں مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس کا انعقاد پنجاب کے مسلمانوں میں ایک نئی سیاسی بیداری کا باعث ہوگا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال ، بارایٹ لاء

○

لاہور

۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس میں پنجاب سے خاصی تعداد کی شرکت کی توقع ہے۔ یونینسٹ مسلمان بھی سرسکندر حیات کی قیادت میں شرکت کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں۔ آج کل ہم ایک پُرآشوب دور سے گزر رہے ہیں اور ہندوستانی مسلمان امید کرتے ہیں کہ آپ اپنے خطبے میں جملہ امور میں جن کا تعلق قوم کے مستقبل سے ہے ان کی کامل اور واضح ترین راہنمائی فرمائیں گے۔ میری تجویز ہے کہ مسلم لیگ ایک مناسب قرارداد کی صورت میں کمیونل ایوارڈ سے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان یا مکرر وضاحت کر دے۔ پنجاب، نیز یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سندھ میں بھی بعض فریب خوردہ مسلمان اس فیصلہ کو اس طرح تبدیل کرنے کے لیے تیار ہیں کہ یہ ہندوؤں کے حق میں زیادہ مفید ہو جائے۔ ایسے لوگ اس

غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندوؤں کو خوش کر کے وہ اپنا اقتدار بحال رکھ سکیں گے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ برطانوی حکومت ہندوؤں کو خوش کرنا چاہتی ہے جو کمیونل ایوارڈ گڑ بڑ کرانے کو خوش آمدید کہیں گے۔ لہٰذا وہ (برطانوی حکومت) کوشش کر رہی ہے کہ اپنے مسلم ایجنٹوں کے ذریعے اس میں گڑ بڑ کرائے۔

مسلم لیگ کونسل کی خالی نشستوں کے لیے میں ۲۸ افراد کی فہرست تیار کروں گا، مسٹر غلام رسول آپ کو وہ فہرست دکھا دیں گے۔ مجھے امید ہے کہ یہ انتخاب پورے غور وخوض سے کیا جائے گا ہمارے آدمی ۱۳ تاریخ کو لاہور سے روانہ ہوں گے۔

مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو مضطرب کر رکھا ہے۔ مسلم لیگ کے مقاصد کے لیے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا ہمارے لیے یہ نادر موقع ہے مجھے امید ہے کہ مسلم لیگ اس مسئلہ پر ایک زوردار قرارداد ہی منظور نہیں کرے گی بل کہ لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس میں کوئی ایسا لائحہ عمل بھی تیار کیا جائے گا جس میں مسلمان عوام بڑی تعداد میں شامل ہو سکیں۔ اس سے (ایک طرف تو) مسلم لیگ کو مقبولیت حاصل ہوگی۔ اور (دوسری طرف) شاید فلسطین کے عربوں کو فائدہ پہنچ جائے۔ ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لیے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔ مشرق کے عین دروازہ پر ایک مغربی چھاؤنی کا قیام (اسلام اور ہندوستان) دونوں کے لیے پُر خطر ہے۔

بہترین تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بارایٹ لاء

لاہور

یکم نومبر ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

سر سکندر حیات خاں اپنی پارٹی کے چند اراکین کے ہمراہ کل مجھے ملے۔ ہمارے درمیان دیر تک مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے باہمی اختلافات پر گفت گو ہوتی رہی۔ دونوں فریقوں کی طرف سے

اخبارات کو بیانات جاری کر دیے گئے ہیں۔ ہر ایک فریق جناح سکندر معاہدہ کے بارے میں اپنی اپنی تاویل کرتا ہے۔ اس سے بہت زیادہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے آپ کو لکھا تھا کہ میں یہ سارے بیانات چند روز میں آپ کو ارسال کروں گا۔ سر دست میری درخواست ہے کہ آپ مجھے اس سمجھوتہ کی ایک نقل۔ جس پر سر سکندر کے دستخط ہیں اور جو میرے علم کے مطابق آپ کے پاس ہے جلد بھجوا دیجئے۔ آپ سے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ آیا آپ صوبائی پارلیمانی بورڈ کو یونینسٹ پارٹی کے اختیار میں دینے پر رضامند ہو گئے تھے۔ سر سکندر کا مجھ سے یہ کہنا ہے کہ آپ اس پر راضی ہو گئے ہیں لہذا ان کا مطالبہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کی بورڈ میں اکثریت ہونی چاہیے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، جناح سکندر معاہدہ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

براہ کرام! اس خط کا جواب جلد از جلد عنایت فرمایئے۔ ہمارے آدمی ملک کا دورہ کر رہے ہیں اور مختلف مقامات پر مسلم لیگ (کی شاخیں) قائم کر رہے ہیں گزشتہ رات لاہور میں ہم نے ایک خاصہ کامیاب جلسہ کیا ہے۔ اب یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بارایٹ لاء

۵

لاہور

۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء

محترم جناح صاحب

سر سکندر اور ان کے احباب سے متعدد گفت گوؤں کے بعد اب میری قطعی رائے ہے کہ سر سکندر اس سے کم کسی چیز کے خواہش مند نہیں کہ مسلم لیگ اور صوبائی پارلیمانی بورڈ پر ان کا مکمل قبضہ ہو۔ آپ کے ساتھ ان کے معاہدہ میں یہ مذکور ہے کہ پارلیمانی بورڈ کی نئے سرے سے تشکیل کی جائے گی اور اس میں یونینسٹ پارٹی کو اکثریت حاصل ہوگی۔ سر سکندر کہتے ہیں کہ آپ نے بورڈ میں ان کی اکثریت تسلیم کر لی ہے۔ میں نے پچھلے دنوں آپ سے خط لکھ کر دریافت کیا تھا کہ کیا واقعی آپ نے پارلیمانی بورڈ میں یونینسٹ اکثریت منظور کر لی ہے؟ ابھی تک آپ نے مجھے اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی۔ ذاتی طور پر مجھے انہیں وہ کچھ دینے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا جس کے وہ خواہش مند ہیں، لیکن جب وہ مسلم لیگ کے عہدیداروں میں مکمل ردو بدل کا مطالبہ کرتے ہیں تو منشائے معاہدہ سے تجاوز کر جاتے ہیں، بالخصوص سیکرٹری (کی علیحدگی کا مطالبہ) حالاں کہ انھوں نے مسلم لیگ کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ مسلم لیگ کی مالیات پر بھی اُن ہی کے آدمیوں کا اختیار ہو۔ میرے خیال میں تو وہ اس طرح مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اُسے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ صوبے کی رائے پوری جان پہچان رکھتے ہوئے، میں مسلم لیگ کو سر سکندر اور اس کے احباب کے حوالے کر دینے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا معاہدے کے باعث پنجاب مسلم لیگ کے وقار کو سخت نقصان پہنچا ہے اور یونینسٹوں کے ہتھکنڈے اسے اور بھی نقصان پہنچائیں گے۔ انھوں نے ابھی تک مسلم لیگ کے منشور پر دستخط نہیں کیے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ کرنا بھی نہیں چاہتے۔ لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس، وہ فروری کی بجائے اپریل میں چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ صوبہ میں اپنی زمین دارہ لیگ کے قیام و استحکام کے لیے مہلت چاہتے ہیں۔ شاید

آپ کو معلوم ہوگا کہ لکھنؤ سے واپسی پر سر سکندر نے ایک زمیندارہ لیگ قائم کی ہے جس کی شاخیں اب صوبہ بھر میں قائم کی جا رہی ہیں۔ اندریں حالات براہ کرم مجھے مطلع فرمایئے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اگر ہو سکے تو بذریعہ تار اپنی رائے سے مطلع فرمایئے ورنہ فوری ایک مفصل خط تحریر فرمایئے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بار ایٹ لاء

○○○

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال معلومات کے آئینہ میں

سوال: علامہ اقبال کس دن پیدا ہوئے؟

جواب: جمعۃ المبارک

سوال: اقبال کس مکان میں پیدا ہوئے؟

جواب: اقبال منزل

سوال: اقبال کی والدہ نے کب وفات پائی؟

جواب: ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو

سوال: علامہ اقبال کا نام کس نے رکھا تھا؟

جواب: والدہ محترمہ امام بی بی نے۔

سوال: اقبال کے والد ماجد کو کن دو کتابوں سے بہت لگاؤ تھا؟

جواب: فتوحات اور مثنوی

سوال: اقبال کا تعلق کس خاندان سے تھا؟

جواب: برہمن کشمیری خاندان سے

سوال: اقبال کے خاندان کی رہائش کس گاؤں میں تھی؟

جواب: چلو پرگنہ اڈوں

سوال: اقبال کے والدین کا مکان جس بازار میں تھا اس کا موجودہ نام کیا ہے؟

جواب: اقبال سٹریٹ

سوال: اقبال کے بچپن کے ہم شوق دوست کا نام بتائیں؟

جواب: سید محمد تقی

سوال: بچپن میں اقبال کو کون سے شوق تھے؟

جواب: بیٹر پالنا، کبوتر اڑانا، اکھاڑے میں ورزش کرنا۔

سوال: والدہ محترمہ کے انتقال پر اقبال نے کونسی نظم لکھی تھی؟

جواب: نظم والدہ مرحومہ کی یاد میں

سوال: تاریخ پیدائش کے لحاظ سے علامہ اقبال کا برج کونسا ہے

جواب: برج ثور

سوال: اسکاچ مشن سکول کب قائم ہوا۔؟

جواب: ۱۸۸۹ء میں

سوال: اقبال نے پرائمری، مڈل اور انٹرنس میں سے کس میں وظیفہ حاصل کیا؟

جواب: تینوں میں

سوال: اقبال کو انٹرنس کے امتحان میں کامیابی کی اطلاع کس موقع پر ملی؟

جواب: شادی کے موقع پر

سوال: میٹرک میں اقبال کا رول نمبر کیا تھا؟

جواب: ۶۷۳

سوال: بی اے میں فلسفہ میں علامہ اقبال کے استاد کون تھے؟

جواب: پروفیسر ڈبلیو بل

سوال: بی اے میں اقبال کے مضامین کون کون سے تھے؟

جواب: انگریزی، فلسفہ، اور عربی

سوال: اقبال نے ایم اے کا امتحان کس ڈویژن میں پاس کیا تھا۔؟

جواب: تھرڈ ڈویژن میں

سوال: ایم اے میں تھرڈ ڈویژن پر اقبال کو وظیفہ ملا یا تمغہ؟

جواب: طلائی تمغہ

سوال: ایم اے فلسفہ میں تھرڈ ڈویژن لینے کے باوجود اقبال کو تمغہ کیوں ملا؟

جواب: علامہ اقبال اس سال پاس ہونے والے واحد امیدوار تھے۔

سوال: فلسفہ میں اقبال کے کون سے استاد غیر ملکی تھے؟

جواب: پروفیسر آرنلڈ

سوال: اسسٹنٹ کمشنر کے امتحان میں علامہ اقبال کو ان فٹ قرار دیے جانے پر کن دو اخبارات نے علامہ اقبال کے حق میں احتجاجا نوٹ شائع کیے تھے؟

جواب: پیسہ اخبار اور کشمیری گزٹ نے

سوال: بی اے میں کن دو مضامین میں اول آنے پر اقبال کو دو طلائی تمغے ملے؟

جواب: عربی اور انگریزی میں

سوال: گورنمنٹ کالج کے کس ہوسٹل میں اقبال نے رہائش رکھی۔

جواب: کواڈرینگل ہوسٹل میں

سوال: علامہ اقبال گورنمنٹ کالج کے جس ہوسٹل میں رہے اس ہوسٹل کا کمرہ نمبر کیا تھا؟

جواب: کمرہ نمبر ۱

سوال: علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش میں جو الجھاؤ تھا یا الجھاؤ کس شخص نے دور کر کے صحیح تاریخ پیدائش ثابت کی۔؟

جواب: فقیر وحید الدین نے

سوال: یوم اقبال کے موقع پر جاری کردہ ڈاک ٹکٹ پر کس سن میں ان کی تاریخ۔۔ پیدائش لکھی گئی؟

جواب: ۱۹۲۷ء میں

سوال: اقبال نے اپنی نظم نالہ فراق کس کی یاد میں لکھی ہے۔؟

جواب: پروفیسر آرنلڈ کی یاد میں

سوال: شیخ بو علی قلندر پانی پتی کا ذکر علامہ اقبال کی کس کتاب میں ملتا ہے؟

جواب: اسرار و رموز میں

سوال: علامہ اقبال کے استاد مولوی میر حسن کا تاریخی نام کیا ہے؟

جواب: رونق بخش

سوال: علامہ اقبال کے استاد آرنلڈ ملازمت سے کس سن میں سبکدوش ہو کر انگلستان چلے گئے تھے

جواب: ۱۹۰۴ء میں

سوال: علامہ اقبال نے پہلی کون سی کتاب تصنیف کی؟

جواب: علم الاقتصاد

سوال: اقبال کی کتنی شادیاں ہوئیں؟

جواب: تین شادیاں

سوال: علامہ اقبال کے پہلے سسر کا نام بتائیں؟

جواب: خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد خان

سوال: اقبال کی دوسری شادی کب ہوئی؟

جواب: ۱۹۰۹ء میں

سوال: دوسری شادی کے نتیجے میں کتنے بچے ہوئے؟

جواب: دو بچے ایک بیٹا جاوید اقبال ایک بیٹی منیرہ

سوال: اقبال کی تیسری شادی کیوں ہوئی؟

جواب: بیوی کے نام چند خطوط کی وجہ سے اقبال بدگمان ہو گئے تھے

سوال: جب اقبال کا بیٹا جاوید اقبال پیدا ہوا تو انھوں نے کیا عہد کیا تھا؟

جواب: یہ کہ بڑا ہونے پر اسے حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر لے جائیں گے۔

سوال: علامہ اقبال نے جاوید اقبال کا تاریخی نام کیا رکھا تھا؟

جواب: ظفر الاسلام

سوال: اپنے بچوں کے متعلق اقبال نے کس دوست کو خط کے ذریعے حالات بتائے تھے اور کب؟

جواب: سر راس مسعود کو ۸ جون ۱۹۳۷ء کو

سوال: علامہ اقبال کے دادا کا کیا نام تھا؟

جواب: شیخ محمد رفیق

سوال: اقبال نے جاوید منزل کی تعمیر کے لیے کس کو نگران مقرر کیا تھا؟

جواب: اپنے بھائی عطا محمد کو۔

سوال: علامہ اقبال نے جاوید منزل کی تعمیر کے لیے میو روڈ پر قطعہ اراضی کب خریدا تھا؟

جواب: ۱۹۳۴ء میں

سوال: علامہ اقبال یورپ کب روانہ ہوئے؟

جواب: ۱۹۰۵ء میں

سوال: یورپ میں اقبال کتنے سال رہے۔

جواب: ۳ سال

سوال: وطن واپسی کے بعد اقبال نے پروفیسری یا وکالت ؟

جواب: وکالت

سوال: وکالت شروع کی تو اقبال کے منشی کے طور پر کسے منتخب کیا گیا؟

جواب: منشی طاہرالدین

سوال: انار کلی بازار کے مکان میں اقبال کب تک مقیم رہے؟

جواب: ۱۹۲۲ء تک

سوال: اقبال نے چیف کورٹ میں یہ درخواست کب دی کہ ان کا نام وکلاء کی فہرست میں درج کر کے انہیں چیف کورٹ ایڈووکیٹ قرار دیا جائے؟

جواب: ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو

سوال: ٹرینٹی کالج میں اقبال کے اہم استاد کون تھے؟

جواب: ڈاکٹر میک ٹیگر یٹ

سوال: اقبال نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے کس عنوان پر مقالہ لکھا؟

جواب: ایران اور مابعد الطبیعات کا ارتقاء

سوال: علامہ اقبال لندن یونیورسٹی میں کس کی جگہ عارضی طور پر کام کرتے رہے؟

جواب: پروفیسر آرنلڈ

سوال: بار ایٹ لاء کی ڈگری کب حاصل کی تھی؟

جواب: ۱۹۰۸ء میں

سوال: لندن یونیورسٹیوں میں اقبال عارضی طور پر رہے یا مستقل طور پر؟

جواب: عارضی طور پر

سوال: کیمبرج میں ایک پکنک کے دوران اقبال نے کونسی بات کہی تھی؟

جواب: زندگی موت کی ابتداء ہے اور موت زندگی کی۔

سوال: انگلینڈ میں کس کے مکان پر اقبال نے شرکائے مجلس کے متعلق فی البدیہہ شعر سنا کر سب کو ہنسایا

جواب: عطیہ بیگم

سوال: علامہ اقبال جرمنی کب گئے تھے؟

جواب: ۱۹۰۴ء میں

سوال: لندن یونیورسٹی میں اقبال کس مضمون کی تعلیم دیتے تھے۔

جواب: عربی کی۔

سوال: جرمنی میں اقبال نہ یادہ عرصہ کہاں رہے۔

جواب: ہائیڈل برگ میں

سوال: اقبال نے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ کس زبان میں لکھا تھا؟

جواب: انگریزی میں

سوال: اقبال کا پی ایچ ڈی کا مقالہ کب اور کہاں شائع ہوا تھا؟

جواب: ۱۹۰۸ء میں انگلینڈ میں

سوال: اقبال نے لارڈ بوتھن سے کیا وعدہ کیا تھا؟

جواب: یہ کہ آکسفورڈ آ کر روڈس لیکچر دیں گے۔

سوال: علامہ اقبال یورپ سے واپسی کے بعد کس کالج میں ملازم ہوئے؟

جواب: گورنمنٹ کالج لاہور میں

سوال: اقبال نے وکالت کب تک جاری رکھی؟

جواب: ۱۹۲۴ء تک

سوال: علامہ اقبال کی ملازمت کے وقت گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کون تھے؟

جواب: مسٹر رابنسن

سوال: گورنمنٹ کالج میں اقبال کب تک پروفیسر رہے؟

جواب: تقریباً ڈیڑھ سال تک

سوال: جناب میں آپ کا شاگرد ہو کر رہوں علامہ اقبال نے یہ الفاظ کس استاد سے کہے؟

جواب: مولوی سید میر حسن سے

سوال: اورینٹل کالج میں اقبال کا ہر پیریڈ کتنے منٹ کا ہوتا تھا؟

جواب: پچاس منٹ کا

سوال: کورٹ سے فارغ ہو کر اقبال شام کن کے دفتر میں گزارتے تھے؟

جواب: مرزا جلال الدین

سوال: وکالت کے دوران علامہ اقبال کس سے ستار بجانا سیکھتے رہے۔

جواب: مرزا جلال الدین کے بیرے سے

سوال: کن کے ہمراہ اقبال اکثر پٹیالہ جایا کرتے تھے؟

جواب: مرزا جلال الدین کے ساتھ

سوال: اقبال ۱۹۳۱ء میں جس جہاز سے لندن گئے تھے اس کا نام بتائیں؟

جواب: ملوجا

سوال: دوسری گول میز کانفرنس کب اور کہاں ہوئی جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔؟

جواب: نومبر ۱۹۳۲ء انگلینڈ میں

سوال: اقبال نے اسلامی ممالک کے دورہ کب کیا؟

جواب: ۱۹۳۱ء میں

سوال: اقبال نے اپنی تاریخی خطبہ کہاں ارشاد فرمایا؟

جواب: الہ آباد میں

سوال: آپ نے کس کے نظریے کے تحت پاکستان بنانے کی ترغیب دی؟

جواب: جمال الدین افغانی

سوال: اقبال کو نوجوانوں سے کیوں محبت تھی؟

جواب: آپ انہیں قوم کے معمار اور ستون سمجھتے تھے اس لیے۔

سوال: علامہ اقبال کو سر کا خطاب کس سن ہجری میں دیا گیا؟

جواب: ۱۳۴۱ ہجری میں

سوال: ۱۹۲۶ء کے الیکشن میں علامہ کے چیف کنویئنر کون تھے؟

جواب: میاں امیر الدین

سوال: پنجاب کی مجلس قانون ساز کے رکن کب منتخب ہوئے؟

جواب: دسمبر ۱۹۲۶ء

سوال: اقبال کس کی دعوت پر کابل گئے تھے؟

جواب: نادر شاہ (افغانستان) کی دعوت پر۔

سوال: نادر شاہ کی دعوت پر اقبال کابل گئے تھے ان کے ساتھ اور کون کون تھا؟

جواب: سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود

سوال: اقبال کس سن میں افغانستان گئے تھے؟

جواب: اکتوبر ۱۹۳۳ء میں

سوال: افغانستان میں علامہ اقبال نے قیام کس کے ہاں کیا تھا؟

جواب: وہ شاہی مہمان تھے۔

سوال: افغانستان کے سفر کے بارے میں علامہ اقبال نے کون سی نظم لکھی تھی؟

جواب: مثنوی مسافر

سوال: پنجاب کی مجلس قانون ساز میں علامہ اقبال کے مخالف لیڈر کون تھے؟

جواب: ملک محمد دین

سوال: علامہ اقبال مسلم لیگ کی ایک شاخ کے صدر تھے نام بتائیں؟

جواب: پنجاب شاخ کے۔

سوال: قائداعظم نے علامہ اقبالؒ کو کس نام سے یاد کیا تھا؟

جواب: پریکٹیکل پالی ٹیشن

سوال: دانائے راز علامہ اقبال کو کس نے کہا تھا؟

جواب: خود علامہ اقبال نے

سوال: سر کا خطاب ملنے پر ہندو مسلم اور سکھ معززین نے اقبال کو کہاں پارٹی دی۔؟

جواب: جہانگیر کے مقبرہ میں۔

سوال: اقبال انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے جنرل سیکرٹری کب بنے؟

جواب: ۱۹۰۹ء میں

سوال: پنجاب کی مجلس قانون ساز کے انتخابات میں علامہ اقبال کی حمایت میں کتنے جلسے ہوئے؟

جواب: تقریباً ۲۰

سوال: مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی اقبال سے ملاقات کی خواہش مند تھی اس کا نام کیا تھا؟

جواب: شہزادی بمبا دلیپ سنگھ

سوال: علامہ اقبال کو مؤتمر عالم اسلامی کا نائب صدر کب چنا گیا؟

جواب: ۱۹۳۱ء اگست ۱۹۳۱ء

سوال: دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے اقبال کس شہر اور کب روانہ ہوئے تھے؟

جواب: بمبئی شہر سے ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو

سوال: علامہ اقبال نے میثاق لکھنؤ کی تائید کی تھی یا مخالفت؟

جواب: مخالفت کی تھی۔

سوال: نہرو رپورٹ پر اقبال کا ردعمل کیا تھا؟

جواب: انھوں نے یہ رپورٹ مسترد کر دی تھی۔

سوال: علامہ اقبال نے سائمن کمیشن کی حمایت کی تھی یا مخالفت؟

جواب: حمایت کی تھی۔

سوال: علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی نے کب استعفیٰ دیا تھا؟

جواب: ۱۹۳۳ء کو

سوال: دوسری گول میز کانفرنس کے دوران لندن میں اقبال کہاں مقیم تھے؟

جواب: ۱۱۲ اے سینٹ جیمز کورٹ

سوال: علامہ اقبال بنگلور کب پہنچے؟

جواب: ۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو

سوال: مصر میں اقبال کا قیام کہاں تھا؟

جواب: قاہرہ میٹروپولٹن ہوٹل میں

سوال: علامہ اقبال میسور کس کی دعوت پر پہنچے

جواب: مہاراجہ میسور کی دعوت پر

سوال: ۱۹۳۵ء کے آخر میں علامہ اقبال کس شہر میں پہنچے؟

جواب: دہلی

سوال: علامہ اقبال عموماً کن زبانوں میں گفتگو فرماتے تھے؟

جواب: پنجابی اور اردو میں جن میں انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کرتے تھے۔

سوال: بنگلور پہنچنے پر اقبال کے کتنے جلسے منعقد ہوئے؟

جواب: دو

سوال: آخری مرتبہ علامہ اقبال حیدرآباد دکن کب پہنچے؟

جواب: ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء

سوال: علامہ اقبال کتنی مرتبہ حیدرآباد دکن گئے تھے؟

جواب: تین مرتبہ

سوال: علامہ اقبال حیدرآباد (دکن) کے لیے کس شہر سے روانہ ہوئے تھے؟

جواب: بنگلور سے

سوال: علامہ اقبال مدراس کب گئے تھے؟

جواب: ۴ جنوری ۱۹۲۹ء کو

سوال: مدراس میں اقبال نے تین لیکچر گوکھلے ہال میں کب دیے تھے؟

جواب: جنوری ۱۹۲۹ء میں

سوال: ایک جریدے نے اقبال نمبر شائع کیا تھا۔ عملے نے یہ نمبر اقبال کو کہاں پیش کیا تھا۔

جواب: بنگلور کے ریلوے اسٹیشن پر

سوال: علامہ اقبال نے میسور جانے کے لیے کونسی سواری استعمال کی تھی؟

جواب: موٹر کار

سوال: سری رنگاپٹم دیکھنے اقبال کب گئے تھے؟

جواب: ۱۱ جنوری ۱۹۲۹ء میں

سوال: علامہ اقبال واپس بنگلور کب آئے؟

جواب: ۱۲ جنوری ۱۹۲۹ء

سوال: علامہ اقبال پہلی مرتبہ کب کشمیر گئے تھے؟

جواب: جون ۱۹۲۱ء کو

سوال: یوم کشمیر منانے کے لیے علامہ اقبال نے اپیل کب شائع کرائی۔؟

جواب: ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو

سوال: کشمیر میں علامہ اقبال کتنی دیر مقیم رہے؟

جواب: دو ہفتے تک۔

سوال: علامہ اقبال کشمیر کیوں گئے تھے؟

جواب: ایک مقدمہ لڑنے کے لیے

سوال: علامہ اقبال کو ایک خطرناک پرانی بیماری تھی یہ بیماری کون سی تھی؟

جواب: درد گردہ

سوال: علامہ اقبال نے درد گردہ کا علاج کس سے کرایا تھا؟

جواب: حکیم نابینا صاحب دہلوی سے

سوال: اقبال کی ایک آنکھ کب بیکار ہو گئی تھی؟

جواب: ۲ سال کی عمر میں

سوال: علاج کے لیے علامہ اقبال بھوپال میں کتنے ہفتے مقیم رہے؟

جواب: چار ہفتے

سوال: اہرام مصر کی سیر علامہ اقبال نے کب کی تھی؟

جواب: ۳ دسمبر ۱۹۳۱ء کو

سوال: علامہ اقبال اٹلی کے شہر روم کب پہنچے تھے؟

جواب: ۲۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو

سوال: اٹلی کے کس جزیرے کے بارے میں علامہ اقبال نے ایک نظم لکھی تھی؟

جواب: جزیرہ سسلی کے بارے میں۔

سوال: اٹلی میں علامہ اقبال کی ملاقات شاہ امان اللہ خان (افغانستان) سے ہوئی تھی تاۓ کب؟

جواب: ۲۵ دسمبر ۱۹۳۱ء

سوال: علامہ اقبال بیت المقدس کب گئے تھے؟

جواب: ۶ دسمبر ۱۹۳۱ء

سوال: بیت المقدس کے علاوہ علامہ اقبال کس جگہ گئے تھے؟

جواب: قطرہ

سوال: علامہ اقبال کس طرح بیت المقدس پہنچے تھے؟

جواب: ریل گاڑی کے ذریعے

سوال: علامہ اقبال نے اٹلی میں کونسا تھیٹر دیکھا تھا؟

جواب: ایمٹی تھیٹر

سوال: علامہ اقبال اسپین کب گئے تھے؟

جواب: ۱۹۳۳ء میں

سوال: علامہ اقبال کو اسپین کی کونسی عظیم الشان عمارت بے حد پسند آئی تھی؟

جواب: الحمرا محل

سوال: علامہ اقبال کس کو اپنا روحانی استاد کہا کرتے تھے؟

جواب: مولانا رومی کو

سوال: انجمن حمایت اسلام کے لیڈروں میں اختلافات کب ہوئے تھے؟

جواب: ۱۹۱۰ء کو

سوال: علامہ اقبال کے کون سے دوست انہیں بالا کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

جواب: چاچا خوشیا

سوال: علامہ اقبال نے کس شاعر کا ایک شعر سن کر اسے شعر کی بجائے نثر لکھنے کی ہدایت کی تھی۔؟

جواب: میاں ایم اسلم (ناول نگار)

سوال: علامہ اقبال کس غیر ملکی یونیورسٹی میں بھی پروفیسر رہے۔؟

جواب: لندن یونیورسٹی میں

سوال: علامہ اقبال کو حکیم الامت کا خطاب کس نے دیا تھا؟

جواب: خواجہ حسن نظامی نے

سوال: علامہ اقبال کی ملاقات کس مشہور ایرانی شاعر سے ہوئی تھی؟

جواب: صادق سرمد مرحوم سے

سوال: ناڈیو یونیورسٹی نے علامہ اقبال کی وفات کے کتنے عرصہ بعد انہیں ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی تھی؟

جواب: ۲۲ سال بعد

سوال: کس ہستی کا ذکر آتے ہی علامہ اقبال کی آنکھیں اشک بار ہو جایا کرتی تھیں؟

جواب: حضرت محمد ﷺ

سوال: علامہ اقبال نے مجذوب فرنگی کس مغربی شاعر کو کہا تھا؟

جواب: نطشے کو

سوال: یہ کھری ہڈی کے لوگ ہیں علامہ اقبال نے یہ الفاظ کس قوم کے بارے میں کہے تھے۔؟

جواب: جرمن قوم کے بارے میں

ooo

ڈاکٹر تبسم کی اقبال فہمی پر اہلِ قلم کی آراء

○ جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال (فرزندِ اقبال)

اقبالیاتی ادب میں "اقبال بحیثیت ادبی نقاد" ایک بالکل نیا موضوع ہے۔ اس موضوع پر تحقیق واقعی قابلِ تحسین ہے۔ ہارون الرشید تبسم نے اقبال کی نظم و نثر سے ان کی عملی تنقید کے پہلو بھی تلاش کر لیے ہیں۔ ان کے مقالہ سے اقبال کے تنقیدی شعور کی عکاسی ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ تحقیقی کام اقبالیاتی ادب میں اہمیت کا حامل ہے۔ امید ہے کہ اہلِ نظر اس کتاب کا خیر مقدم کریں گے۔

○ ڈاکٹر وزیر آغا

علامہ اقبالؒ کی شاعری اور افکار پر نہایت قابلِ قدر کام ہو چکا ہے مگر "علامہ اقبال بحیثیت ادبی نقاد" کے موضوع پر آج سے پہلے کوئی مبسوط کام نہیں ہوا تھا۔ یہ کام ہارون الرشید تبسم نے بڑی محنت سے انجام دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے ہاں عملی تنقید کے نمونے بہت کم ہیں لیکن نظری تنقید کے باب میں انھوں نے بڑے اور جل خیالات کا اظہار کیا ہے جن کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت تھی ہارون الرشید تبسم قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے ایم فل کے لیے اس موضوع کو چنا اور پھر موضوع سے انصاف کرنے کی بھرپور کوشش کی..........

○ ڈاکٹر رحیم بخش شاہین

علامہ اقبالؒ کے شیدائی کی حیثیت سے مجھے جب بھی یہ خبر ملتی ہے کہ علامہ اقبالؒ پر کوئی کتاب شائع ہو رہی ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کا تحقیقی مقالہ "علامہ اقبالؒ بحیثیت ادبی نقاد" کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ اس سے آپ کے شوق کی فراوانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجھے

توقع ہے کہ آپ کے مقالہ کی اشاعت سے علامہ اقبالؒ کے ان تنقیدی نظریات کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی جن کے زیر اثر برصغیر کے شاعروں اور ادیبوں میں زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب تخلیق کرنے کے رجحان کو تقویت ملی ۔ خدا کرے کہ آپ کے مقالے کو شاعروں اور ادیبوں کے حلقوں میں بطور خاص پذیرائی حاصل ہو تا کہ عصر حاضر میں پیامِ اقبال کی اشاعت کا امکان روشن ہو اور ادب کا کارواں صحیح سمت میں گامزن ہو سکے۔

○ پروفیسر محمد منور مرزا

میں سمجھتا ہوں کہ ہارون الرشید تبسم صاحب نے اسی بنیادی رمز کو تفصیل سے بیان کر کے حضرت علامہ کے ناقد شعر ہونے کی حیثیت واضح کی ہے۔ قبل ازیں ان کی تین کتب اقبال جو اقبال ہے ،حیات اقبال کا سفر، بیت بازی اقبالیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی نظم ونثر کے مطالعہ اور تحقیق کے لیے تبسم نے کتنی عرق ریزی کی ہے۔اس مقالہ میں اقبال کے تنقیدی شعور کو واضح کرنے کے لیے ان کا تحقیقی زاویہ نظر قابل تحسین ہے۔

○ پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

سلسلہ تصنیف و تالیف تبسم صاحب کے اکتسابات و کمالات کا ایک پہلو ہے چنانچہ وہ مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں شائع کر چکے ہیں ۔ان کی موجودہ کتاب ''اقبال بحیثیت ادبی نقاد'' قابل ستائش ہے۔اس مقالہ کی تیاری کے دوران انھوں نے اکثر مجھ سے رابطہ کیا اور وقت طلب مراحل میں سیر حاصل بات چیت کا سلسلہ جاری رکھا۔اس اہم اور مشکل موضوع پر زاہد منیر عامر، ڈاکٹر خورشید رضوی ،ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، ڈاکٹر آغا یمین، ڈاکٹر اختر حسن ملک اور پروفیسر منور مرزا سے اس موضوع پر رہنمائی کے لیے جب بھی ہارون الرشید تبسم لاہور آئے انھوں نے مجھ سے بھی بطور خاص ملاقات کی اور اس موضوع کے بارے میں مشورے حاصل کیے۔

مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے اپنے موضوع کی ساتھ انصاف کیا اور اقبال کی نظم ونثر سے ان کی تنقید کے مختلف پہلو تلاش کیے۔ تنقید اقبال کے وسیع وضخیم بڑھتے اور پھلتے پھولتے ذخیرے میں مختلف لکھنے والے بقدر ظرف وتوفیق حصہ لے رہے ہیں۔ پروفیسر ہارون الرشید تبسم بھی اس کارِ خیر میں اپنا حصہ شامل کر رہے ہیں۔ امید واثق ہے کہ اقبال بحیثیت ادبی نقاد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

○ ڈاکٹر انور سدید

پروفیسر ہارون الرشید تبسم کا ذکر آئے تو میں انھیں ہمیشہ رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور اپنے بڑھاپے کو ان کی جوانی کی مثال سے تازہ دم کر لیتا ہوں۔ وہ لمبی مسافت پر آہستہ روی سے چلنے والے سیاح ہیں، جس قریب کی منزل کو تیزی روں سے جا لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ ماؤنٹ ایورسٹ پر پہنچ کر فتح کا جھنڈا لہرا دیتے ہیں۔ میں اس وقت دامن کوہ میں اپنا سانس درست کرنے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہوں۔ ان کی ایک اچھی عادت یہ ہے کہ وہ مجھے فراوانی سے روز ملاقات کا موقعہ عطا کرتے ہیں۔ میں جب انھیں آٹھ دس اخبارات میں روز ملتا ہوں تو میرے سینے میں بھی کام کرنے کی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے۔ پھر میں بے اختیار کہہ اٹھتا ہوں:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ابھی کل کی بات ہے ہارون الرشید تبسم گلے میں بستہ ڈالے کوٹ فرید سے پیدل چل کر پرائمری سکول کی طرف جا رہے تھے آج وہ ایم اے، ایم فل ہو چکے ہیں۔ متعدد کتابوں اور ان گنت مضامین کے مصنف ہیں۔ ہزاروں شاگرد پیدا کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور پروفیسر زاہد منیر عامر ایک شام لاہور نہر کے بائیں کنارے پر آباد مسجد سے نماز مغرب پڑھ کر نکلے تو کہنے لگے: "ہارون الرشید تبسم پی ایچ ڈی کے لیے موضوع تلاش کر رہے ہیں" میں نے کہا" ان کو

کسی موضوع پر کام کیے بغیر ہی ڈگری دے دی جانی چاہیے۔ان کا سابقہ کام کسی ڈگری یافتہ سے کم نہیں"

زاہد منیر عامر نے کہا: "یہ بات تو ہے"

مجھے خوشی ہوئی کہ وہ ایم فل کا مقالہ جو علامہ اقبال کی تنقید کے موضوع پر لکھا گیا اب کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔میں نے یہ مقالہ تیاری کے دوران سرسری طور پر دیکھا تھا اور اس تحقیق کام پر ہارون الرشید تبسم کو داد بھی دی تھی۔خدا کرے یہ جلدی چھپ جائے اور اپنی نظیر آپ ثابت ہو۔ میں ان کی مزید کامیابیوں کو بحیثیت خود دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔

○ پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض

Mr. Haroon ur Rashid Tabassum has completed his course of studies and research of M.phil in Iqbaliyat and the degree has been conferred upon him on 25th April , 1993 . His overall performance has been "A" grade and he is expected to win more laurels in the field of research. He has completed his thesis on the topic of Iqbal can be extended for further research leading to a Doctorate in some other University of Pakistan since this institution has not started research at that level as yet. I wish this Promising scholar brimming success in his life.

○ ڈاکٹر ایوب صابر

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم سے ملاقات تو ۲۰۱۲ء میں ہوئی لیکن محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک

دوسرے کو ایک مدت سے جانتے ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں ۲۳ دسمبر ۲۰۱۲ء کو قائد اعظم کانفرنس میں روبرو ہوئے۔ ۲۳ ستمبر ۲۰۱۳ء کو نظریہ پاکستان کونسل سرگودھا شاخ کی افتتاحی تقریب میں ڈاکٹر تبسم کو صدارت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ چیئرمین نظریہ پاکستان کونسل زاہد ملک بھی ہارون الرشید تبسم سے بہت متاثر ہوئے۔ یوم اقبال کے موقع پر انھیں نظریہ پاکستان کونسل میں بطور مقرر مدعو کیا گیا۔'' ڈاکٹر ایوب صابر بطور اقبال شناس'' کی اشاعت کے بعد اقبالیات پر ان سے گفت گو کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کی کتاب ''خورشید اقبال'' پر نظریہ پاکستان کونسل نے انھیں گولڈ میڈل سے سرفراز کیا۔ ان کی اقبال شناسی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ زیر نظر کتاب ''کائنات اقبال'' ان کی اقبال دوستی کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے ایک ہی کتاب میں سو رنگ رعنائی کے بھر دیے ہیں حیات اقبال اور فکر اقبال کے حوالے سے یہ کتاب ایک آئینہ ہے جس میں نو آموز محققین ضرورت کے مطابق مواد حاصل کر سکتے ہیں۔

۲۰۱۵ء میں ڈاکٹر تبسم کی آٹھ کتب جبکہ ۲۰۱۶ء میں ان کی ۱۶ کتب کی اشاعت حیران کن بات ہے۔ پاکستان کی ادبی دنیا میں اس قسم کی مثال خال خال نظر آتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے اس تحقیقی سرمایہ سے نسل نو استفادہ کرے گی۔

○ انوار فیروز

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ مفکر پاکستان علامہ اقبال کے شیدائی ہیں اور ان کے بارے میں مضامین نظم و نثر کو یکجا کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ انھوں نے برس ہا برس کی محنت کے بعد ''خزینہ اقبال'' کے نام سے کتاب مرتب کی ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے اقبالیات پر ہی ایم فل کیا اور اب وہ تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں۔ خزینہ

اقبال واقعی خزینہ ہے۔ اس کتاب سے علامہ اقبال کی جملہ شعری ونثری تصانیف کے مضامین کا ایک نظر میں تعارف ہو جائے گا اور یہ علم بھی ہو جائے گا کہ علامہ اقبال کی کونسی کتاب کب شائع ہوئی۔ جو لوگ نادر کتب کا مطالعہ نہیں کر سکے وہ اس کتاب سے استفادہ کر سکیں گے کیونکہ اس کتاب میں علامہ اقبال کی تمام تحریروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے سات ابواب ہیں، پہلا اردو شاعری، دوسرا فارسی شاعری، تیسرا نثر اقبال، ۔۔۔۔۔ پانچواں مکاتب اقبال، چھٹا درسی کتب، اور ساتواں حیات اقبال کا سفر شامل ہے۔ تمام کتابوں پر اسی طرح تبصرہ کیا گیا ہے کہ قارئین کو تمام معلومات حاصل ہو سکیں۔ غرض یہ کتاب اقبال کے بارے میں معلومات کا خزانہ ہے اور ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے انتہائی کاوش سے کتاب مرتب کی ہے۔ ۲۸۸ صفحات پر مشتمل سفید کاغذ، کمپیوٹرائزڈ کتابت کتابت کے ساتھ جملہ کتاب کی قیمت ۴۰۰ روپے ہے، ملنے کا پتہ مکتبہ تعمیر انسانیت غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور۔

○ انوار فیروز

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی دوسری کتاب کا نام ہے "اقبال کے گوہر شہوار" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کو افکار اقبال سے عشق ہے اور وہ یہ خزانہ تلاش کر کے ہم جیسے علم و ادب کے طالب علموں کے لیے لا رہے ہیں۔ جسٹس (ر) جاوید اقبال نے اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "علامہ اقبال پر لکھی جانے والی ایک سو کتب کے مندرجات، مضامین، اور مکمل فہرست فراہم کرنا ان پر مربوط و مبسوط تبصرے کرنا اور اہم امور پر حوالہ جات فراہم کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے ہر کتاب پر بہت ہی عمدہ تجزیاتی مطالعہ کیا ہے جس میں کسی قسم کی کوئی تشنگی نہیں ہے۔ ہر کتاب کے بارے میں قاری بہت سی معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ کتاب اقبالیاتی ادب میں ایک اہم دستاویز کے طور پر سامنے آئی ہے۔" جس کتاب کی تعریف ڈاکٹر جاوید اقبال کر دیں اس پر ہم جیسا شخص کیا تبصرہ کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی اور اقبال اکادمی پاکستان کے ناظم محمد سہیل عمر نے بھی کتاب کی

تعریف کی ہے۔

بقول ڈاکٹر تبسم اس کتاب سے اقبالیاتی محققین کے لیے بہت آسانی پیدا ہوگی۔ جن سو کتابوں کا ذکر ہے ان میں مشاہیر ادب کی لکھی ہوئی کتابیں شامل ہیں، چند نام پیش کرتا ہوں، پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض، پروفیسر رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر عبادت بریلوی، رئیس احمد جعفری، محمد حنیف شاہد، ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی، ایوب صابر، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر راشد حمید، عاشق حسین بٹالوی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر عبدالاسلام۔

یہ ایک بہت اہم کتاب ہے جو اقبال شناسوں کے لیے انسائیکلوپیڈیا اور گائیڈ کا کام دے گی۔ ڈاکٹر الرشید تبسم کے کام کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ ۴۸۸ صفحات کی جملہ کتاب کی قیمت ۶۰۰ روپے ہے۔ ملنے کا پتہ مکتبہ تعمیر انسانیت غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور۔

○ پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول

ہارون الرشید تبسم کی کتاب ''ڈاکٹر وزیر آغا بطور اقبال شناس'' میں ان کا ایک مضمون ہے'' عالمی سطح پر اقبال شناسی کا رجحان'' اس مضمون میں انھوں نے پاکستان سے باہر اقبال شناسوں کے اسماء گرامی بھی تحریر کیے ہیں۔ پاکستان مین اقبال شناسوں کے ناموں کو تحریر کرتے وقت انھوں نے ۲۴۳ اقبال شناسوں کے اسماء لکھے ہیں اگر ان میں سے پانچ نام نکال دیے جائیں جو سہواً دوبار لکھے ہو سکتے ہین تو اقبال شناسوں کی تعداد ۲۳۸ بنتی ہے۔ ان سب ناموں کی فہرست بنانا نہایت محنت طلب کام ہے لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اقبال اور اقبال شناسوں سے کتنی محبت ہے۔

محبت ہی نہیں رکھتے بل کہ ان سے مسلسل رابطے میں رہتے ہیں۔ ان کی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب'' خورشید اقبال'' ضخیم کتاب ہی نہیں بل کہ واقعی اقبالیات کا انسائیکلوپیڈیا ہے جو محقق بھی اقبال کے بارے میں لکھی گئی کتابوں سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہے وہ یہی کتاب پڑھ کر اپنا

مقصد حاصل کر سکتا ہے۔ اس ایک کتاب کا مطالعہ اس کو دیگر کتابوں کے مطالعے سے بے نیاز کر دے گا۔

○ ابوالمعانی عصریؔ

پروفیسر ہارون الرشید تبسم کی شخصیت فن پر تبصرہ کرنے سے پیشتر تبصرہ نگار کو کچھ لمحات کے لیے اپنی فکری کائنات کے کنارے پر سکوت کیفیت میں ششدر حالت میں کھڑا ہونا پڑے گا' وجہ کچھ بھی ہو ایک دلیل یہ بھی ہے کہ موصوف اپنے ذوق وسعت مطالعہ میں کہاں سے کہاں جا نکلا ہے۔ اس کے ذوق طالب علمی نے اسے بہت سی خوبیوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ وہ جہاں ایک صاحب مطالعہ درس و تدریس سے تعلق رکھنے والا فرد ہے۔ وہاں وہ ایک ہونہار اور ذہین طالب علم بھی ہے۔ وہ اپنی فکری جالانیوں کو مزید توانا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی لگن میں مگن نجانے کہاں پہنچ چکا ہے؟
زیر تبصرہ کتاب مستطاب بعنوان "اقبال جو اقبال ہے" میرے دعویٰ کی صداقت میں ایک واضح دلیل ہے اور بقول پروفیسر محمد منور مرزا کہ پروفیسر ہارون الرشید تبسم فضائے علم و ادب کے ہردم' پردم شاہین' شعر بھی خوب کہتے ہیں' نثر بھی اچھی لکھتے ہیں۔ شوق علم بھی ہے' ذوق تحقیق بھی' سیماب صفت' روح بے تاب کے مالک' پاکستان کے جانباز مجاہد' حضرت قائداعظم کے فدائی' حضرت علامہ اقبال کے پروانہ وار عقیدت مند' خدا ان کو مزید ہمت سے نوازے اور نوازے رکھے (آمین) میں اپنی علمی بے مائیگی و بے بضاعتی کے باوجود یہ بات کہنے میں باک نہیں رکھتا کہ موصوف نے انتخاب عنوان کے بعد جس صدق مطالعہ سے نتیجہ عنوانات پر پوری تندہی سے شبانہ روز مطالعہ اور ژرف نگاہی سے اختصار کی محنت اور مسلسل کاوش کا عزم صمیم قائم رکھا اور اپنی فکری خوشہ چینی کے اعتراف میں طویل کتابیات کا تذکرہ بھی کرنے میں عذر نہ جانا' بل کہ اسے اعتراف سند دلوانے کے لیے راشگاف اظہار کر دیا۔ یہ بات اگرچہ ایک لحاظ سے اقبالیات کے طالب علم کے لیے ازبس ضروری ہے لیکن جدت افکار کا تنوع تو بہر حال صاحب فکر قلم کار کا ذاتی ہی ہوا کرتا ہے اور یہی فکری تنوع اقبالیات کے طالب علم کو معزز بناتا ہے۔ میں

فرداً فرداً تجزیہ عنوانات اور ان عنوانات سے متعلقہ کتابیات کی فہرست کا مذکور طوالت کے خوف سے ضروری نہیں سمجھتا' حالانکہ ان کا مذکورہ بھی ایک خاصے کی چیز ہوتی ہے اور روح تبصرہ کو اجاگر اور واضح کرتی ہے۔ لیکن موضوعات کی وسعت نے جہاں نئے گوشوں اور جہتوں کی نشاندہی کی ہے۔ وہاں یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ اور اس کے فکری تصورات اور معاشرتی وسماجی رویوں اور سیاسی نظریات اور عملی سیاست میں بھرپور کردار ادا کرنے کی ضرورت واہمیت میں ظہور پذیر ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور یہی عمل ثبوت حضرت قائداعظم کی شعوری سیاست برصغیر میں انقلاب لاتی ہے۔ جس کی اہمیت کو تاریخ عالم نے اعتراف کی سند سے نوازتے ہوئے آئندہ زمانوں میں ہونے والی دوغلی سیاست کے مقابلے میں اصولی سیاست کے عملی فروغ میں زینہ اول قرار دیا اور مسلم امہ کے اتحاد کو ناگزیر قرار دیا۔ لیکن ہماری کوتاہیوں نے ہماری محرومیوں کو جنم دیا۔ یقیناً یہی فکری وتصوراتی سوچ مسلم سیاست کی ''انقلابی رستخیز'' کے امکانات کی ترجمان بنی اور اسی شعور سیاست کے خلاف اس وقت تک سازشوں کے جال بنے جارہے ہیں۔ جس کا مسلم امہ کے زعما کو ادراک بھی نہیں ہوسکا یقیناً اس رفعت فکر کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ ''اقبال جو اقبال ہے'' وہ کئی ایسے پوشیدہ مضمرات سے پردہ اٹھاتی ہے کہ کتاب کی فکری افادیت بھی سامنے لاتی ہے۔ اور اس کو مزید اجاگر کرنے کے لیے سنجیدہ فکر قاری کے ذہن کو منفرد بھی کرتی ہے۔ بلاشبہ ''اقبال جو اقبال ہے'' اقبالیات کے وسعت پذیر موضوع پر ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ یقیناً ایسی کتب کی ضرورت بھی ہے اور ان کتب کے مسلسل مطالعہ سے ان محرومیوں کا ادراک بھی ہوسکے گا جس سے مسلم امہ دوچار چلی آرہی ہے۔

پروفیسر ہارون الرشید تبسم اس کاوش بلیغ پر مبارک باد کے مستحق ہیں جس کے لیے انہوں نے اپنی راتوں کا سکھ چین قربان کرکے یہ گراں قدر فریضہ سرانجام دیا ہے۔ میری دعا ہے کہ خداوند کریم ان کی اس کاوش کو صدقہ جاریہ کا مرتبہ عطا فرمائے۔ آمین

○ پروفیسر شوکت واسطی

فکر اقبال کے مختلف گوشوں پر کام ہو چکا ہے اور جاری ہے۔ اقبال بحیثیت ادبی نقاد بالکل نیا اور منفرد موضوع ہے۔ ہارون الرشید تبسم نے اس منفرد موضوع کے ساتھ تخلیقی انصاف کر کے ادب میں اپنا نام بنا لیا ہے۔ اقبالیاتی ادب کے حوالے سے اقبال کو بطور نقاد پیش کر کے اس نوجوان نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔

میں حیران ہوں کہ بزم آرائی کے ساتھ ساتھ خیال آرائی کی یہ ندرت تبسم میں کس طرح موجود ہے۔ بزم علم و فن ان کی شخصیت اور ادبی خدمات پر بجا طور پر فخر کرتی ہے۔

○ میرزا ادیب

علامہ اقبالؒ کے شعری کارناموں کا بہت ذکر ہو چکا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے۔ ان کارناموں میں عموماً علامہ کے شعری اور نثری کاموں کے لیے ان موضوعات کو مرکزِ توجہ بنایا ہے جن کے حوالے سے بہت کچھ تحریری طور پر سامنے آ چکا ہے مگر ہارون الرشید تبسم نے موضوع کے انتخاب میں ندرت فکر کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے یقینِ واثق ہے کہ تبسم کا یہ مقالہ نہ صرف توصیف و تحسین کا مستحق قرار پائے گا بل کہ علامہ کی فکر و نظر کی ان جہتوں کی طرف بھی اہل نظر کی توجہ مبذول کرائے گا۔ جن کی طرف خاص توجہ نہیں کی گئی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم تبسم کے اس کارنامے کا بے تابی سے انتظار نہ کریں۔

○ ڈاکٹر خورشید رضوی

پروفیسر ہارون الرشید تبسم صاحب کی ذات اب کسی تعارف کی محتاج نہیں رہی۔ وہ نہ صرف تدریس کے حوالے سے اپنے تلامذہ کے ہر دلعزیز استاد ہیں۔ بل کہ ان کے نتائج قلم سے وطن عزیز کے اہل نظر بھی بخوبی واقف ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں انہیں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی طرف سے

ان کے مقالے "علامہ اقبال بحیثیت ادبی نقاد" پر ایم فل کی ڈگری دی گئی تھی۔ اقبالیات کے حوالے سے یہ نیا موضوع ہے اور پروفیسر ہارون الرشید تبسم کی کاوش اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہے مقامِ مسرت ہے کہ یہ مقالہ اب کتابی شکل میں شائع ہو کر افادہ عام کا باعث بن رہا ہے۔ میں اس اشاعت کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

○ گوہر ملیسانی

علامہ اقبالؒ بیسویں صدی کی وہ نابغۂ روزگار شخصیت ہے جس نے عصر حاضر کے ادب کو فکری جہتیں عطا کی ہیں۔ ان کے افکار و تصورات اور فنی لوازمات پر بے شمار کتب اور تحقیقی مقالات احاطۂ تحریر میں آ چکے ہیں اور "ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است" کے مصداق ہر ادیب نے علامہ اقبالؒ کے فکر و فن کی گرہیں کھولنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ کے عشق و مستی سے لبریز اشعار معجزۂ فن سے درخشندہ و تابندہ ہیں۔ جناب پروفیسر ہارون الرشید تبسم نے اپنے ایم فل (اقبالیات) کے مقالے کے لیے ادبی تنقید کے تناظر میں فکر و فن کے بحرِ امواج سے گہر ہائے تابدار تلاش کیے ہیں۔ اقبالؒ کے حوالے سے اس موضوع کی اہمیت جس قدر دوامی ہے اس کا عمیق مطالعہ اور پھر نتائج اخذ کرنا بھی انتہائی دشوار ہے۔ مگر تبسم نے شعر و سخن کی ہنر مندی کو اپنا نخچیر بنایا ہے اور اہل نظر کے لیے ذوقِ نظر کا سامان فراہم کیا ہے۔

○ ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

علامہ اقبالؒ بحیثیت ادبی نقاد" پروفیسر تبسم کی تحقیقی و تنقیدی کاوش کا لائقِ تحسین و توجہ نتیجہ ہے اس سے پہلے بھی ان کی کئی اور کتب شائع ہو چکی ہیں جنہیں علمی و ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ملی ہے۔ تبسم جس محنت، لگن اور جذبۂ صادق کے ساتھ قلم کی جولانیاں دکھا رہے ہیں۔ اس سے لگتا ہے کہ وہ

فارغ بیٹھنے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ اور اس عمر میں بالخصوص ایک استاد۔ کے لیے فارغ بیٹھنا واقعی گناہ سے کم نہیں ہے۔ ایسا استاد ہی اپنے سپرد ہونے والی نسل کی بہترین تربیت کر سکتا اور اس میں اپنے اپنے میدان میں جی لگا کر اور سچے جذبوں کے ساتھ کام کرنے کی روح پھونک سکتا ہے۔ یہ وہ کام ہے جس کے دور رس شاندار نتائج سامنے آتے ہیں۔

تبسم کی مذکورہ کتاب اگرچہ ان کے ایم فل کا مقالہ ہے لیکن انھوں نے محض ڈگری کے حصول کی خاطر یہ کام نہیں کیا بل کہ جہاں اسے علامہ اقبال سے اپنی محبت و عقیدت کا عملی نمونہ بنا کر پیش کیا ہے وہاں اقبالیات میں ایک نئے موضوع کا بھی اضافہ کیا ہے اور جس انداز میں اس موضوع کو پیش کیا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کتنی گہرائی میں جا کر اپنا یہ علمی فریضہ انجام دیا ہے۔ ایسا کام وسیع مطالعے اور ادب پر گہری نظر کا متقاضی ہے اور تبسم کی اس تصنیف میں یہ دونوں باتیں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

سچی بات ہے کہ مجھے ایسے محنتی شوق و جذبہ سے سرشار اور موضوع سے بھرپور انصاف کرنے والے اس صاحب علم نوجوان پر بڑا رشک ہوتا ہے۔ اللہ اسے نظر بد سے محفوظ فرمائے (آمین)۔ کاش ہمارے تمام نوجوان بالخصوص شعبہ تعلیم سے متعلق نوجوان انہی جذبوں سے سرشار ہو کر محنت اور لگن سے کام کریں تاکہ نئی نسل کی صحیح تربیت کا سامان ہو سکے۔ عزیزی تبسم کے لیے یہی دعا ہے کہ مولا کریم انہیں صحت و سلامتی سے رکھے مزید ہمت اور لگن سے نوازے تاکہ وہ اس میدان میں ایک مثالی اہل قلم کا رتبہ پالیں۔ ایسے نوجوان قوم و ملک کے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ ان کے حق میں مزید دعا یہ کہ

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

○ ڈاکٹر آغا یمین

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے کورس ۲۰۷ سن ۱۹۸۸ء میں پروفیسر ہارون الرشید

تبسم کو میری زیر نگرانی ایم فل (اقبالیات) کے تحقیقی کام کا موقع ملا تو مجھے ان کی مخفی صلاحیتوں کا پتہ چلا۔ انھوں نے نہایت عرق ریزی سے اقبال اور مابعد الطبیعات' اقبال اور تصور بے خودی' اقبال اور اسلامی نظام' اقبال اور مرد کامل' اقبال کا جداگانہ ملی تشخص' جدید علم الکلام' یورپ کے علوم و فنون اور اقبال' اقبال اور تصوف کے روحانی پہلو' اقبال اور خدا کا تصور کامل' خودی اور بے خودی کا فلسفہ ایسے اہم موضوعات پر پروفیسر ہارون الرشید تبسم نے تحقیقی کام میں سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے جتنے مقالات مجھے ارسال کئے وہ سب معیاری اور تعریف کے قابل تھے۔ انھوں نے تحقیق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اس کا حق ادا کر دکھایا۔

انھوں نے "اقبال جو اقبال ہے" "حیات اقبال کے سفر" اور "بیت بازی اقبالیات" تین کتب تحریر کر کے اقبالیاتی ادب میں اپنا مقام پیدا کیا۔ مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور نے ان تین کتب کی اشاعت کر کے پروفیسر ہارون الرشید تبسم کے کام کو مزید وسعت دی۔

ہارون الرشید تبسم کا زیر نظر مقالہ "علامہ اقبال بحیثیت ادبی نقاد" بالکل نیا اور اچھوتا موضوع ہے۔ اس پر کام کرنا بہت مشکل تھا۔ وسیع مطالعہ اور تحقیقی لگن کے بغیر یہ کام بہت مشکل تھا لیکن لگن محنت او رشوق نے پروفیسر تبسم کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور بفضل تعالیٰ انھوں نے ایم فل کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ اقبال کے اس دقیق موضوع سے نباہ کرنا بڑا تحقیقی کارنامہ ہے اس کتاب کی اشاعت پر میں ہارون الرشید تبسم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

○ ذوالفقار احسن

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی نئی تحقیقی و علمی کتاب "ڈاکٹر وزیر اقبال بطور اقبال شناس" زیور طباعت سے آراستہ ہو گئی ہے۔ جس میں انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی اقبال شناسی کو موضوع بحث بنایا ہے اور اس سلسلہ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے لکھے ہوئے مضامین کو مختلف کتابوں اور رسائل میں سے ڈھونڈ

نکالا ہے جو لائبریریوں کی الماریوں میں مقفل پڑے تھے اور شاید آئندہ چند برسوں میں دیمک کی نذر ہو جاتے۔ ڈاکٹر تبسم نے ان تمام مضامین کو نہ صرف تلاش کیا بلکہ انہیں ایک نہایت خوبصورت کتاب کی صورت میں یکجا کر کے بہت بڑی علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے۔ ڈاکٹر تبسم نے ایک طرف اقبالیاتی کتب میں اضافہ کیا ہے تو دوسری طرف ڈاکٹر وزیر آغا کے اقبال پر لکھے ہوئے مضامین کو محفوظ کرتے ہوئے وزیر آغا کو بطور اقبال شناس سامنے لے کر آئے ہیں۔ کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا کا بھرپور تعارف ان کی کتابوں کی فہرست (بمع ادارہ، ناشر، صفحات، قیمت اور ملنے کا پتہ) کے علاوہ ان پر لکھی گئی کتب کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی رحلت کے بعد شائع ہونے والی اہم کتب کے علاوہ ادبی رسائل کے نمبروں اور گوشوں کا بھی تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے اور ان رسائل کی فہرست بھی دے دی گئی ہے جن میں "کاغذی پیرہن"، "اسالیب"، "ادب معلی"، "تجدید نو"، "نالہ دل"، "مخزن"، "تمام"، "راوی" اور "الحمرا" شامل ہیں گویا ڈاکٹر وزیر آغا پر ہونے والے کام کا اشاریہ ہے۔ اس اشاریہ کی مدد سے کئی محققین استفادہ کی صورتیں نکالیں گے۔

یہ کتاب جہاں ڈاکٹر وزیر آغا سے متعارف کرواتی ہے تو دوسری طرف شاعر مشرق علامہ محمد اقبال سے بھی ملاقات کراتے ہوئے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے یوں تمام مضامین ہی قابل توجہ اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن کچھ مضامین ایسے ہیں جن کا تذکرہ یہاں کرنا بہت ضروری خیال کرتا ہوں۔ ان میں "اقبال اور شپنگلر"، "کلام اقبال میں ڈرامے کا عنصر" اور "اردو ادب میں طنز و مزاح اور اقبال" ایسے مضامین اور گوشے ہیں جن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ خاص کر ان کی نظموں میں تمثیلی نگاری اور کلام اقبال میں طنز و مزاح کو ہمیشہ صرف نظر کیا گیا تھا۔

علامہ محمد اقبال ایک ایسی نابغہ روزگار شخصیت تھے جن کی فکر و فلسفہ سے پوری دنیا نے فیض حاصل کیا ہے ان کے خطبات اور مقالات کو دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا ہے۔ ایران، جرمنی، افغانستان، ترکی، انگلستان، اور دیگر ممالک میں ہونے اقبالیاتی کام کا جائزہ بھی کتاب

میں شامل ہے۔ عالمی سطح پر اقبال شناسی ڈاکٹر تبسم کا ایک نہایت عمدہ مضمون کتاب میں شامل ہے جس میں عالمی سطح پر اقبالیات میں ہونے والے کام پر طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔

○ ذوالفقار احسن

حکیم الامت، شاعر مشرق علامہ محمد اقبال ایسے شاعر و فلسفی ہیں جن کو مغرب و مشرق میں یکساں پڑھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے علاوہ ان کے فکر و فن پر دنیا بھر میں کتب شائع ہوئیں۔ پڑوسی ملک بھارت میں بھی علامہ محمد اقبال کے فکر و فلسفہ پر کام کرنے والے بہت زیادہ ہیں اسی طرح ایران میں بھی علامہ محمد اقبال پر تحقیقی کام کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ وہاں یوم اقبال پورے جوش و جذبے کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ علامہ محمد اقبال پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے فکر و فن پر لکھی گئی ۳۶۵ کتابوں کا تحقیقی و توضیحی جائزہ ''خورشید اقبال'' میں شامل ہے۔ جائزہ کے لیے علاوہ ۳۶۵ کتابوں کی ابتدائی معلومات اور مکمل فہرست مضامین بھی کتاب کی زینت ہیں۔ اسے ناشر نے اقبالیات کا انسائیکلوپیڈیا قرار دیا ہے۔ اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ مختلف موضوعات پر ۳۶۵ کتب کا خزینہ لیے ہوئے یہ کتاب ۲۵ ستمبر ۲۰۱۴ء کو مطلع ادب پر نمودار ہوئی۔

○○○

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا اقبالیاتی سرمایہ

- اقبال جو اقبال ہے
- اقبال کے گوہر شہوار
- تقاریر اقبال
- خزینہ اقبال
- اقبال اور سرگودھا
- ڈاکٹر ایوب صابر بطور اقبال شناس
- خورشید اقبال (اقبالیات کا انسائیکلوپیڈیا)
- ذخیرۂ اقبال
- ڈاکٹر زاہد منیر عامر متفکر و اقبال شناس
- ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بحیثیت اقبال شناس
- تفہیم فکر اقبال اور جسٹس جاوید اقبال (زیر طبع)
- اقبال بحیثیت ادبی نقاد
- قندیل اقبال
- بیت بازی اقبالیات
- حیات اقبال کا سفر
- کلام اقبال کا موضوعاتی آئینہ
- ڈاکٹر وزیر آغا بطور اقبال شناس
- کائنات اقبال
- بہار اقبال

نایاب تاریخی تصاویر کے ساتھ

عظیم تاریخی شخصیات | شاہکار سوانح عمریاں

ان کتابوں کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے!

حضرت عمرو بن العاص ؓ	(فاتح مصر)	ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن
سلطان محمد فاتح	(فاتح قسطنطنیہ)	ڈاکٹر محمد مصطفےٰ صفوت
حضرت خالد بن ولید ؓ	(اللہ کی تلوار)	صادق حسین صدیقی سردھنوی
محمد بن قاسم	(فاتح سندھ)	صادق حسین صدیقی سردھنوی
طارق بن زیاد	(فاتح اندلس)	صادق حسین صدیقی سردھنوی
سلطان سبکتگین	(دولتِ غزنویہ کا عظیم بادشاہ)	صادق حسین صدیقی سردھنوی
سلطان محمود غزنوی	(بت شکن)	صادق حسین صدیقی سردھنوی
سلطان شہاب الدین غوری	(عظیم فاتح)	صادق حسین صدیقی سردھنوی
عماد الدین زنگی	(عظیم فاتح)	صادق حسین صدیقی سردھنوی
صلاح الدین ایوبی	(فاتح بیت المقدس)	ہیرلڈلیم / مترجم: محمد یوسف عباسی
ظہیر الدین بابر	(بابر دی ٹائیگر)	ہیرلڈلیم / مترجم: سید ہاشمی فرید آبادی
امیر تیمور	(جس نے دنیا ہلا ڈالی)	ہیرلڈلیم / مترجم: محمد عنایت اللہ
چنگیز خان	(وحشت اور جنون کا نشان)	ہیرلڈلیم / مترجم: سید ذیشان نظامی
سقراط	(عظیم فلسفی)	کوراامیسن / مترجم: آنسہ صبیحہ حسن
سکندر اعظم	(عظیم فاتح)	انجم سلطان شہباز
شیر شاہ سوری	(شیر دل بادشاہ)	انجم سلطان شہباز
حیدر علی	(سلطنت خداداد کا بانی)	نریندر کرشن سنہا
اورنگ زیب عالمگیر	(شہنشاہ مغلیہ سلطنت)	رئیس احمد جعفری
ابن خلدون	(مؤرخ، فقیہ، فلسفی اور سیاستدان)	ڈاکٹر طٰہٰ حسین
عمر خیام	(فارسی شاعر اور فلسفی)	سید سلیمان ندوی
امیر خسرو	(فارسی و ہندی شاعر، ماہر موسیقی)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن

نفیس طباعت، اعلیٰ کاغذ، خوبصورت سرورق اور مضبوط بائنڈنگ

ناشران: بُک کارنر شوروم بالمقابل اقبال لائبریری بُک سٹریٹ جہلم پاکستان

اقبالؒ رحمۃ اللہ علیہ

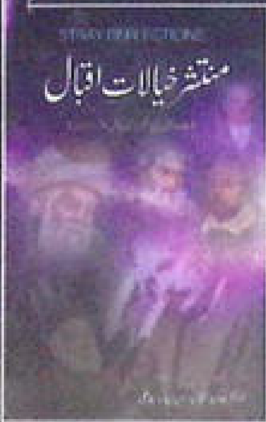
اور

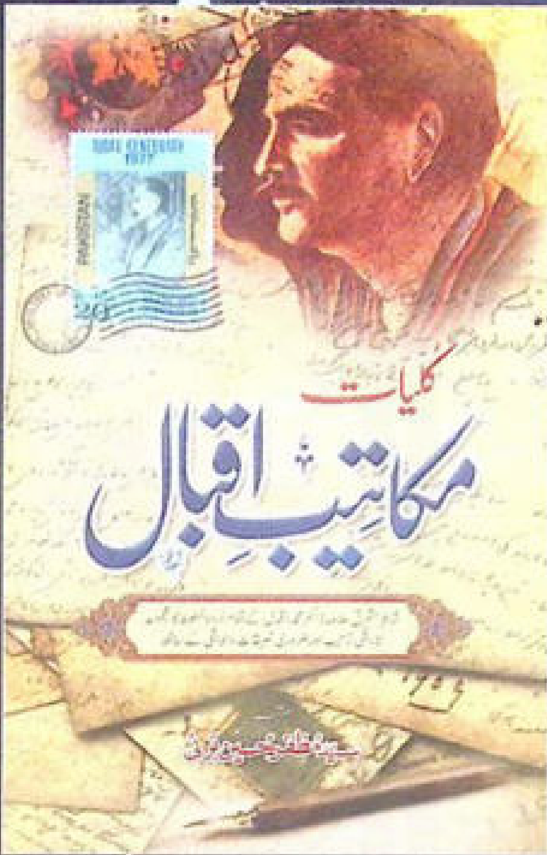
مغربی مفکّرین

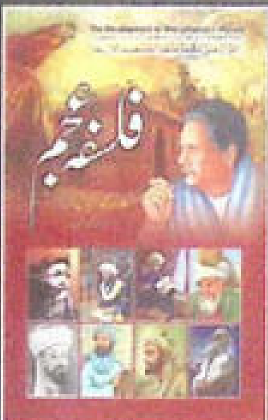
جگن ناتھ آزاد

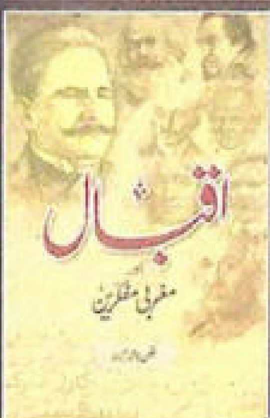
بک کارنر
جہلم، پاکستان

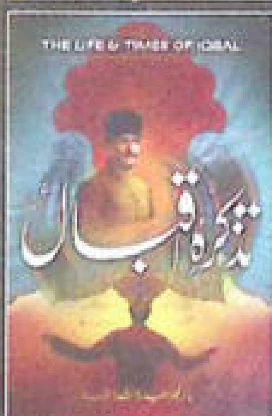
اقبالیات بک کارنر

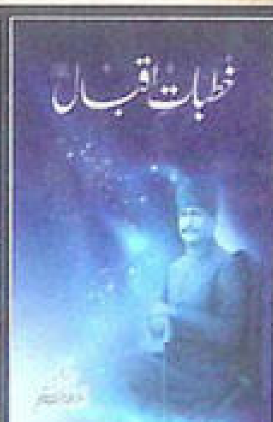












ناشرین
بک کارنر

facebook
book corner showroom
website
www.bookcorner.com.pk
email
@bookcorner.com.pk

ISBN: 978-969-662-076-1

Rs. 480.00

Title Design by Abu Imama